۱۶ مارچ ۲۰۲۵ء | بسم اللہ الرحمن الرحیم | جلد نمبر: ۱۸ ۔ شمارہ نمبر: ۶

پندرہ روزہ
# معارف فیچر کراچی
MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، محمود الحق صدیقی، نوید نون ۔ معاون مدیران: غیاث الدین، م ع فاروقی

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰

فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱۔۳۶۳۴۹۸۴۰ (۲۱۔۹۲)

برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلا تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون، نقطۂ نظر، خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں، اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

۴ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید، لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

# امریکا اسرائیل تعلقات کا کمزور مستقبل؟

*Dr Mohammad Makram Balawi*

امریکا کے سابق وزیرِ خارجہ ہنری کسنجر نے کبھی کہا تھا کہ امریکا کا دشمن ہونا خطرناک ہے مگر اِس سے کہیں زیادہ خطرناک ہے امریکا کا دوست ہونا۔ یہ بات جتنی متعلق آج معلوم ہوتی ہے اُتنی پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ امریکا عالمی سیاست و معیشت میں اپنے قائدانہ کردار کو برقرار رکھنے کے لیے جو کچھ کر رہا ہے، اُس کے نتیجے میں اُن ممالک سے بھی اُس کے تعلقات داؤ پر لگے ہوئے ہیں جنہیں اُس کا مضبوط ترین اور سب سے قابلِ اعتماد حلیف اور پارٹنر سمجھا جاتا رہا ہے۔ امریکا سے اتحاد اور پارٹنرشپ کا معاملہ بھی اب مشروط نوعیت کا ہوتا جا رہا ہے۔ ویسے تو یہ حقیقت دوسرے بہت سے معاملات میں بھی جھلک رہی ہے مگر اِسے سب سے زیادہ امریکا سے اسرائیل اور یوکرین کے تعلقات کے آئینے میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اسرائیل عشروں تک امریکا سے جُڑا رہا ہے اور اِس دوران ایک مضبوط لابی نے واشنگٹن میں اُس کے تعلقات کی جڑیں گہری اور مضبوط کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ دوسری طرف امریکا سے یوکرین کے تعلقات سیاسی، معاشی اور جغرافیائی حقیقتوں کے تناظر میں کمزور یا طاقتور ہوتے رہے ہیں۔ یوکرین کو امریکا سے امداد بدلتی ہوئی سیاسی حقیقتوں کے تناظر میں ملتی رہی ہے۔ اب معاملہ یہ ہے کہ تیزی سے بدلتی ہوئی عالمی سیاست کے تناظر میں امریکا سے اسرائیل کے تعلقات بھی متاثر ہو رہے ہیں۔ اسرائیل کو امریکی قیادت کی نظر میں جو مقام حاصل رہا ہے، وہ اب اپنا اثر کھوتا ہوا معلوم ہو رہا ہے۔ امریکا میں یہودیوں کی نئی نسل کی سوچ بدل رہی ہے۔ نوجوان امریکی یہودیوں کا اخلاقی تناظر تبدیل ہو رہا ہے۔ یوکرین کے معاملات کو دیکھیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ امریکا ہر معاملے میں سودے بازی کے موڈ میں ہے۔ ہر چیز کو خالص کاروباری تجارتی زاویے سے دیکھا جا رہا ہے۔ جو کچھ یوکرین کے معاملے میں ہوا ہے، اُس کے نتیجے میں امریکا اور اسرائیل کے تعلقات بھی داؤ پر لگتے دکھائی دینے لگے ہیں۔

دی امریکن اسرائیل پبلک افیئرز کمیٹی اور ایک مضبوط صہیونی لابی نے مل کر ایک مدت تک اسرائیل کو امریکی قیادت کی آنکھوں کا تارا رکھا ہے۔ واشنگٹن میں اسرائیل کی جڑیں گہری کرنے میں اِن دونوں گروپوں کا کردار غیر معمولی اور فیصلہ کن رہا ہے۔ اِن دونوں گروپوں کی کاوشوں سے اسرائیل کو سالانہ اربوں روپے کی اقتصادی و عسکری امداد ملتی رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ عالمی اداروں میں امریکا نے اسرائیل کو سفارتی معاملات میں استثنائی حیثیت دلوانے میں بھی کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ امریکا اور اسرائیل کے تعلقات میں جو غیر معمولی کیفیت پائی جاتی رہی ہے وہ صرف لابنگ کا نتیجہ رہی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ امریکا میں آباد یہودیوں کی سوچ بھی دوطرفہ تعلقات کو بہتر بنائے رکھنے میں کلیدی کردار کی حامل رہی ہے۔ امریکی یہودیوں نے عمومی طور پر اسرائیل کو اپنے لیے ایک مذہبی و ثقافتی پناہ گاہ کے طور پر دیکھا ہے۔ یہ سوچ دوسری جنگِ عظیم کے دوران نازی جرمنوں کے ہاتھوں یہودیوں کے قتلِ عام اور سرد جنگ کے دور کے (مشرقِ وسطیٰ کے لیے) جمہوری آدرشوں کی وساطت سے پیدا ہوئی ہے۔ یوکرین کا معاملہ بہت مختلف ہے۔ امریکا میں یوکرین کے لیے بہتر امکانات پیدا کرنے والی کوئی لابی ہے نہ یوکرین سے آبائی تعلق رکھنے والوں کی اِتنی واضح تعداد ہی ہے جو کچھ کرے۔ بہر کیف، اسرائیل کی لابی اور امریکی یہودیوں نے اسرائیل کے لیے جو بنیاد تیار کی تھی، وہ اب ہل رہی ہے۔

امریکی یہودیوں کی نئی نسل میں عمومی طور پر اور ترقی پسند یا لبرل سوچ رکھنے والے یہودی نوجوانوں میں اسرائیل کے لیے حمایت کا گراف گر چکا ہے۔ پچھلی نسل کے امریکی یہودی اسرائیل کو ایک جمہوری اتحادی کے روپ میں دیکھتے تھے جبکہ امریکی یہودیوں کی نئی نسل اسرائیل کو نسل پرست ریاست سمجھتی ہے۔ اس تبدیلی کو سوشل میڈیا نے شدید تر کر کے ہتھیار کی سی شکل دے دی ہے۔ غزہ میں جو کچھ اسرائیل فوج نے کیا ہے، جو قتلِ عام ہوا ہے اور جو تباہی واقع ہوئی ہے اُس کی تصویروں نے جواں سال امریکی یہودیوں کی سوچ بدل دی ہے۔ کسی زمانے میں امریکی یہودی ہر معاملے میں

## اندرونی صفحات پر


- ٹرمپ کی معاشی غیر حقیقت پسندی
- 'وحدۃ الظل': فلسطینی جانبازوں کا خفیہ ترین یونٹ
- قابض اسرائیلی فوج کا نیا سربراہ اور غزہ کا مستقبل
- محمد الضیف جس نے تاریخ کا رخ بدل ڈالا
- ٹیسلا اور امریکا کا زوال
- طلبہ یونین کی بحالی کیوں ضروری ہے؟
- بڑھتا دباؤ، ایران دوراہے پر!
- جنوبی افریقا کی معاشی مشکلات
- شام: تشدد کی نئی لہر کے پیچھے کون؟




Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

اسرائیل کا بھرپور دفاع کیا کرتے تھے مگر اب اُن کے اخلاقی معیارات بدل چکے ہیں۔

جیوئش وائس فار پیس اور اِف ناٹ ناؤ جیسی امریکی تنظیمیں فلسطینی علاقوں پر اسرائیل کے قبضے کے خلاف، اسرائیلی مصنوعات کے بائیکاٹ اور اسرائیل میں امریکی سرمایہ کاری ختم کرنے کا مطالبہ منوانے کے لیے ہزاروں افراد کو متحرک کرتی ہیں۔ امریکا کے پیو ریسرچ سینٹر کے ۲۰۲۳ء کے ایک سروے کے مطابق ۴۰ سال سے کم عمر کے ۵۲ فیصد امریکی یہودی اسرائیل کی حکومت کو شدید نسل پرستی کی مرتکب قرار دیتے ہیں۔ کسی ایسی کمیونٹی میں سوچ کی یہ تبدیلی اس لیے اہم ہے جسے عشروں سے یہ کہانی سُنائی جاتی رہی ہو کہ اُن کے لیے اسرائیل ہی حقیقی پناہ گاہ ہے۔

اس دوران اسرائیل کی قیادت حقائق کو نظر انداز کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے یا شاید حقائق سے آشنا ہی نہیں ہے۔ اسرائیلی وزیرِاعظم بنیامین نیتن یاہو کے انتہائی دائیں بازو کے حکمراں اتحاد، محکمہ قانون کی اوور ہالنگ کے نتیجے میں چیک اینڈ بیلنس کے جمہوری نظام کے خاتمے اور امریکی یہودی ناقدین کو یکسر مسترد کردینے سے اسرائیل کے لبرل اتحادی بھی اب دور ہوتے جارہے ہیں۔ اسرائیل قومی ریاست ہے۔ اس کے آئین اور قانون میں یہودیوں کو برتر تسلیم کیا گیا ہے۔ فلسطینی علاقوں پر قبضے کے ذریعے یہودیوں کی آباد کاری کا سلسلہ جاری رکھے جانے سے تنازع مزید شدت اختیار کرتا جارہا ہے۔

اِس امر میں اب کوئی شک نہیں رہا کہ امریکی اور اسرائیلی یہودیوں کے درمیان پیدا ہونے والی فکری خلیج اب کُھلی جنگ میں تبدیل ہوتی جارہی ہے۔ امریکی یہودی، جن کی اکثریت سیکولر اور ترقی پسند ہے، مساوات اور سب کو ساتھ لے کر چلنے کی بات کرتے ہیں۔ دوسری طرف اسرائیلی یہودی، بالخصوص نیتن یاہو کے زیرِ اثر رہنے والے، نسل پرستی پر مبنی قوم پرستی کو گلے لگائے ہوئے ہیں۔ وہ فلسطینی علاقوں پر قبضہ کرکے وہاں یہودیوں کو آباد کرنے کو اسرائیل کی سلامتی یقینی بنانے کے لیے ناگزیر سمجھتے ہیں۔ ۲۰۲۱ء کی غزہ جنگ میں امریکی و اسرائیلی یہودیوں کی یہ جنگ زیادہ کُھل کر سامنے آئی۔ اسرائیلی میڈیا نے اسرائیلی فوج کی فلسطینی علاقوں پر بمباری کو اپنے دفاع کے حق کے طور پر پیش کیا تاہم امریکی یہودیوں نے فلسطینیوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کے سمعی و بصری ثبوتوں سے سوشل میڈیا پر طوفان برپا کردیا۔

امریکی و اسرائیلی یہودیوں کا یہ تصادم اب زہریلا ہو چکا ہے۔ اسرائیلی حکام امریکی یہودیوں پر غداری کا الزام عائد کررہے ہیں۔ ڈونلڈ ٹرمپ کے سابق اسٹریٹجسٹ اسٹیو بینن جیسے لوگ لبرل اور ترقی پسند یہودیوں کو اسرائیل کے بدترین دشمنوں میں شمار کررہے ہیں۔ اس نوعیت کی باتوں سے یہ تو بالکل واضح ہو چکا ہے کہ اسرائیلی حکومت کے نزدیک اُس کی رائے سے اختلاف غداری کے مترادف ہے۔

کسی زمانے میں اسرائیل کو مشرقِ وسطیٰ کی واحد جمہوری ریاست کا درجہ حاصل تھا۔ اب اسرائیل کو ایمنیسٹی انٹرنیشنل اور ہیومن رائٹس واچ کے ساتھ ساتھ اسرائیلی گروپ B'Tselem کی طرف سے بھی نسل پرستی کے الزام کا سامنا ہے۔ ایک طرف انٹرنیشنل کرمنل کورٹ غزہ میں اسرائیلی فوج کے جنگی جرائم کے حوالے سے تحقیقات کررہی ہے اور دوسری طرف دی بائیکاٹ، ڈیویسٹمنٹ اینڈ سینکشنز نامی تحریک بھی دنیا بھر کے اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں زور پکڑ رہی ہے۔

اسرائیل الگ تھلگ ہوتا جارہا ہے اور یہ حقیقت امریکی یہودیوں کے لیے بہت اذیت ناک ہے۔ اسرائیل کے بارے میں یہ پروپیگنڈا کیا جاتا رہا ہے کہ وہ محفوظ پناہ گاہ ہے۔ یہ دعویٰ قدم قدم پر چیک پوائنٹس، فلسطینیوں کے مکانات کے گرائے جانے اور الگ تھلگ کیے جانے والے راستوں سے ٹکراتا ہے۔ امریکا اور اسرائیل کے جواں سال یہودیوں کی نفسی ساخت میں بھی ماضی بہت اچھی طرح گڑا ہوا ہے۔ جب وہ فلسطینیوں کی بے گھری دیکھتے ہیں تو اُنہیں اپنے اجداد کا دربدر ہونا یاد آتا ہے۔ ۲۰۲۲ء کے ایک سروے کے مطابق امریکا میں ۳۵ سال سے کم عمر کے ۲۵ فیصد یہودی اسرائیل کے وجود کو یہودی ریاست کے نمونے کے طور پر پیش کیے جانے کے مخالف ہیں۔ کبھی اِس نوعیت کی سوچ کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

امریکی یہودیوں کی سوچ کو تبدیل کرنے میں بنیامین نیتن یاہو کی پالیسیوں نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ حکومت برقرار رکھنے کے لیے نیتن یاہو کو الٹرا آرتھوڈوکس یہودیوں پر منحصر رہنا پڑتا ہے۔ اس کے نتیجے میں اسرائیل کی حکومت نان آرتھوڈوکس یہودیوں کو انگوٹھے تلے رکھنے کی کوشش میں مصروف رہتی ہے۔ شادی اور مذہب کی تبدیلی سے متعلق قوانین میں نان آرتھوڈوکس یہودیوں کو امتیازی سلوک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ غزہ پر انتہائی نوعیت کی بمباری اور فلسطینی خواتین، بچوں اور معمر افراد کے بہیمانہ قتلِ عام نے اسرائیل کی رہی سہی ساکھ بھی ختم کردی ہے۔

امریکا نے جس طور یوکرین کو تنہا چھوڑ دیا ہے، وہ اسرائیل کے لیے بھی بہت بڑے انتباہ کا درجہ رکھتا ہے۔ یوکرین نے روسی فوج کا سامنا کرنے کے لیے بنیادی طور پر امریکی ہتھیاروں کا سہارا لیا مگر اب اُسے، امریکا کی بے اعتنائی اور ری پبلکنز کی شدید مخالفت کے باعث، اپنے دفاع کے لیے یورپ کے سامنے ہاتھ جوڑنا پڑ رہے ہیں۔ فضائی دفاع کے معاملے میں یوکرین اب یورپ کی مدد کے بغیر کچھ زیادہ کر ہی نہیں سکتا۔ کسی زمانے میں یوکرین کے صدر وولودومیر زیلنسکی امریکی کانگریس میں غیر معمولی حمایت حاصل تھی۔ جو کچھ اب یوکرین کے ساتھ ہو رہا ہے، وہ اِس بات کا مظہر ہے کہ کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر بننے والے اتحاد بالآخر ایسی موت مرتے ہیں۔ جب مفادات تبدیل ہوتے ہیں تو ایسے اتحاد خاتمے کی طرف ہی جاتے ہیں۔

اسرائیل بھی اِس کیفیت سے محفوظ نہیں۔ ڈونلڈ ٹرمپ سب سے پہلے امریکا کی رٹ لگائے ہوئے ہیں۔ انہوں نے ایک طرف اسرائیل کو سفارت خانہ تبدیل کرنے کی تحریک دی اور فلسطینی علاقوں کو اسرائیل میں ملانے کی حمایت بھی کی تاہم یہ سب کچھ مفادات کے تحت تھا۔ امریکا کے لیے اسرائیل تب تک پیارا ہے جب تک وہ کام کا ہے۔ اگر اسرائیل امریکا کو دوبارہ عظمت سے ہم کنار کرنے کے بیانیے سے متصادم ہوا تو ٹرمپ کے دوسرے عہدِ صدارت میں امریکی قیادت اسرائیل کو مسترد بھی کرسکتی ہے۔

قابض اسرائیلی ریاست اب دوراہے پر کھڑی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکا کے منتخب اداروں میں یہودی لابی بہت مضبوط ہے مگر معاملہ مقدار تک محدود ہے، معیار کا معاملہ کچھ اور ہے۔ اس لابی کے پاس اخلاقی سرمایہ نہیں۔ امریکی یہودی کسی زمانے میں اسرائیل کے سخت جان حلیف تھے مگر اب وہ انصاف کے عالمگیر تصور کو قبائلی بنیاد پر کی جانے والی حمایت پر ترجیح دے رہے ہیں۔ امریکا میں قومی سطح پر یہ سوچ ابھر رہی ہے کہ ہر حال میں سب سے پہلے امریکی مفادات دیکھنے چاہئیں۔ اس سوچ نے اسرائیل اور امریکا کے تعلقات کو کمزور کرنا شروع کردیا ہے۔ امریکا کے جواں سال یہودی بیرونی تنازعات کے مقابلے میں ملک کی حدود میں پائے جانے والے مسائل (عدم مساوات، ماحول کی گراوٹ وغیرہ) کو زیادہ اہمیت دے رہے ہیں۔

////// باقی صفحہ نمبر ۵ \\\\\\

# ٹرمپ کی معاشی غیر حقیقت پسندی

Yang Xuemin

امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے کینیڈا اور میکسیکو سے درآمدات پر ۲۵ فیصد ٹیرف (درآمدی ڈیوٹی) نافذ کرنے کا جو اعلان، دوسری مدت کے لیے امریکی صدر کا منصب سنبھالتے ہی کیا تھا، وہ اُنہوں نے واپس لے لیا ہے۔ خیر، یہ اقدام ۲/اپریل ۲۰۲۵ء تک کے لیے ہے۔ اِس اقدام سے امریکا کی مستقبل قریب کی تجارتی پالیسی کی سمت کے حوالے سے شکوک و شبہات اور سوالات ابھرے ہیں۔ جو کچھ امریکی صدر اس وقت کر رہے ہیں، وہ عالمی معیشت کے لیے انتہائی خطرناک نتائج کا حامل ہوسکتا ہے۔

صدر ٹرمپ نے جس ٹیرف کو عارضی طور پر واپس لینے کا اعلان کیا تھا، اُس کا اعلان فروری کے اوائل میں کیا گیا تھا۔ کچھ ہی دن بعد اُنہوں نے ٹیرف واپس لینے کا اعلان کیا تھا اور ۴ مارچ ۲۰۲۵ء کو یہ ٹیرف ایک بار پھر نافذ کر دیے گئے۔ ۵ مارچ کو امریکا کے ٹاپ آٹو میکرز فورڈ، جنرل موٹرز اور اسٹیلانٹِز کے چیف ایگزیکٹیوز سے ملاقات کے بعد صدر ٹرمپ نے پھر استثنیٰ کا اعلان کیا۔

ٹرمپ کی تجارتی پالیسی نے چند ہفتوں کے دوران غیر معمولی یوٹرن لیے ہیں اور اِس میں کئی ٹوئسٹ سامنے آئے ہیں۔ اس کے نتیجے میں اندرون اور بیرونِ ملک غیر یقینی کیفیت پیدا ہوئی ہے۔ ٹرمپ کی تجارتی پالیسی کا ابہام عالمی تجارت کے مسائل بڑھانے کا باعث بن رہا ہے۔ اس حوالے سے تازہ ترین پیش رفت نے پورے شمالی امریکا میں تجارت اور سرمایہ کاری کے حوالے سے غیر یقینی کیفیت پیدا کی ہے۔

کینیڈا کے وزیر اعظم جسٹن ٹروڈو کہتے ہیں کہ امریکی صدر نے جو تجارتی جنگ شروع کی ہے، وہ جلد اور آسانی سے ختم نہیں ہوگی۔ ایک بیان میں اُنہوں نے کہا کہ عالمی تجارت میں چند ہفتوں کے دوران اچھا خاصا تناؤ پیدا ہوا ہے اور یہ سب کچھ صدر ٹرمپ کا کیا دھرا ہے۔ جسٹن ٹروڈو کا یہ بھی کہنا تھا کہ جو خرابیاں صدر ٹرمپ عالمی تجارت کے لیے پیدا کر رہے ہیں، وہ تادیر رہیں گی اور مستقبل قریب میں یہ تجارتی جنگ ختم ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔

چین کی رینمن یونیورسٹی میں انسٹیٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیئرز کے ڈائریکٹر وینگ یِوی کہتے ہیں کہ امریکی صدر کی طرف سے ٹیرف کا نفاذ دراصل کمزوری کی علامت ہے۔ یہ کوئی جامع اور ٹھوس حکمتِ عملی نہیں بلکہ ہنگامی طور پر دنیا کو ڈرانے اور اپنے معاملات کے لیے تھوڑی سی ریلیف مانگنے کی کوشش ہے۔

وینگ یِوی کا کہنا ہے کہ جس طور چین نے ٹیرف کا ڈٹ کر سامنا کیا ہے، بالکل اُسی طور اگر دیگر ممالک بھی کچھ آگے بڑھیں تو ٹرمپ کو پسپا ہونا پڑے گا۔ اِس سلسلے میں اُنہوں نے امریکا اور کینیڈا کے درمیان انحصار کا بھی حوالہ کیا ہے۔ جب صدر ٹرمپ نے کینیڈا کے خلاف ٹیرف کا اعلان کیا تو کینیڈین حکومت نے بھی جوابی اقدام کے طور پر امریکی مصنوعات پر ٹیرف کا اعلان کر دیا۔ دونوں ممالک کے درمیان چونکہ تجارت بہت زیادہ ہے۔ کینیڈین وزیر اعظم نے جب ۱۰۷/ارب امریکی ڈالر مالیت کی امریکی مصنوعات پر ۲۵ فیصد ٹیرف کا اعلان کیا تو امریکی قیادت کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ امریکی کاروباری اداروں نے صدر ٹرمپ اور اُن کی معاشی ٹیم سے رابطہ کر کے بات کی اور اُن پر زور دیا کہ وہ امریکی معیشت کو ٹیرف کے گڑھے میں نہ دھکیلیں۔ وینگ یِوی کا کہنا ہے کہ امریکا کسی ملک کی مصنوعات پر درآمدی ڈیوٹی نافذ کرے تو وہ ملک بھی جوابی اقدام کے طور پر امریکی مصنوعات پر درآمدی ڈیوٹی عائد کرے گا اور یوں دوطرفہ تجارت شدید متاثر ہوگی۔

امریکی صدر نے ٹیرف کا اعلان کر کے دنیا بھر میں ہنگامہ برپا کیا ہے۔ میکسیکو اور کینیڈا کے علاوہ چین کی مصنوعات پر بھی ٹیرف لگانے کا اعلان کیا گیا ہے۔ یہ سب کچھ عالمی معیشت کے لیے خطرناک ہے کیونکہ کسی ایک بڑی ملکی معیشت کے متاثر ہونے سے بہت سے ملکوں کی معیشت متاثر ہوتی ہے۔

امریکی قیادت کی طرف سے عائد کیے جانے والے ٹیرف پر دنیا بھر میں شدید ردِعمل سامنے آیا ہے۔ یورپ اور کینیڈا میں امریکی مصنوعات کی فروخت گھٹ گئی ہے اور بعض معاملات میں تو نوبت بائیکاٹ تک پہنچ گئی ہے۔ یورپ اور کینیڈا میں بہت سوں نے کہا ہے کہ اگر امریکا ٹیرف کے معاملے میں لچک نہ دکھائے تو لازم ہے کہ امریکی مصنوعات خریدنے سے گریز کیا جائے۔ کینیڈا کے صوبوں اونٹاریو، کیوبیک اور مینیٹوبا میں پہلے ہی بڑے اسٹورز سے امریکی شراب ہٹانے کا اعلان کیا جاچکا ہے۔ بہت سے کینیڈینز نے امریکا میں تعطیلات گزارنے کا شیڈول منسوخ کر دیا ہے۔

کینیڈین وزیر اعظم نے سوشل میڈیا پلیٹ فارمز پر ایک پوسٹ میں لکھا ہے کہ اب ہمارے لیے وقت آ گیا ہے کہ ملک میں تیار کی جانے والی مصنوعات کے انتخاب کو اولیت دیں۔ خریداری کے وقت لیبل چیک کرنا لازم ہے۔ ہماری پہلی ترجیح ملکی مصنوعات کی خریداری ہونی چاہیے۔ جہاں تک ممکن ہو صرف کینیڈین مصنوعات استعمال کی جائیں۔ معاملات کی خرابی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ کھیلوں کے مقابلوں کے آغاز پر جب امریکی قومی ترانہ بجایا گیا تو لوگوں نے ہوٹنگ کی۔

سوئیڈن، ناروے، فرانس اور دیگر یورپی ملکوں میں ہزاروں افراد امریکی مصنوعات کے بائیکاٹ کی مہم سے جُڑے ہوئے ہیں۔ فیس بک گروپ لوگوں پر زور دے رہا ہے کہ کوکا کولا، مکڈونلڈ اور اسٹار بکس جیسے امریکی اداروں کی مصنوعات کو ترک کر کے اُن کا یورپی متبادل تلاش کریں۔ ناروے کی کمپنی ہالٹ بیک بنکرز نے امریکا کے فوجی جہازوں کو ایندھن کی فراہمی روکنے کا اعلان کیا ہے۔

امریکی کمپنیوں کو دنیا بھر میں شدید ردِعمل کا سامنا ہے۔ امریکی آن لائن پلیٹ فارمز امیزون، نیٹ فلکس وغیرہ کو بھی شدید مزاحمت کا سامنا ہے۔ یورپ میں ٹیسلا کی فروخت صرف جنوری کے دوران ۵۰ فیصد سے زیادہ گھٹ گئی ہے۔ بہت سے صارفین اپنے آرڈر منسوخ کر کے متبادل کی طرف جارہے ہیں۔ یورپین آٹو موبائل مینوفیکچررز ایسوسی ایشن کا کہنا ہے کہ چند ہفتوں کے دوران امریکی گاڑیوں کی فروخت گھٹی ہے اور یورپی برانڈز تیزی سے مقبولیت حاصل کر رہے ہیں۔

ماہرین کی رائے یہ ہے کہ ڈونلڈ ٹرمپ نے عالمی معیشت کے بنیادی محرکات کو سمجھنے میں غلطی ہے۔ وہ بزنس مین رہے ہیں، ماہرِ معاشیات نہیں۔ وہ مالیاتی امور کی تکنیکی باریکیوں کے بارے میں بھی زیادہ نہیں جانتے۔ ایک تربیت یافتہ معیشت دان جس طور منصوبہ سازی کر سکتا ہے ویسی منصوبہ سازی ڈونلڈ ٹرمپ کر سکتے ہیں نہ مکمل طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ عالمی تجارت کو وہ اپنی مرضی کے مطابق چلانا چاہتے ہیں۔ یہ سوچ انتہائی خطرناک ہے۔ وینگ یِوی کا کہنا ہے کہ جو کچھ بھی ٹرمپ کر رہے ہیں، وہ عالمی معیشت اور بالخصوص تجارت کے حوالے سے اُن کے ذہن میں پائے جانے والے مغالطوں کی بنیاد پر ہے۔ ٹرمپ نے عالمگیریت کا کچھ اور ہی مطلب سمجھ لیا ہے۔ وہ اس مغالطے کا شکار ہیں کہ بہت سے ممالک امریکا سے بھرپور فائدہ اٹھا رہے ہیں جبکہ امریکا کو کچھ خاص فائدہ نہیں پہنچ رہا۔ ڈونلڈ ٹرمپ کے ذہن میں پنپنے والا ایک بڑا مغالطہ یہ بھی ہے کہ یورپی یونین دراصل امریکا کو نچوڑنے کے لیے بنائی گئی

تھی۔ یہ سوچ انتہائی مضحکہ خیز ہے مگر کیا کیجیے کہ ڈونلڈ ٹرمپ کے ذہن میں یہی چلتا رہتا ہے۔

اس وقت امریکی معیشت کو نئے سِرے سے ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔ امریکا ایک زمانے سے دنیا بھر میں اپنی مصنوعات بہت بڑے پیمانے پر فروخت کرتا آیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اُس نے اپنی عسکری قوت کی بنیاد پر بھی ایسا بہت کچھ حاصل کیا ہے جسے حاصل کرنا اُس کا استحقاق تھا ہی نہیں۔ ڈونلڈ ٹرمپ اور اُن کی ٹیم نے مل کر امریکی معیشت کو نئی زندگی دینے کے بارے میں جو کچھ سوچا ہے، وہ انتہائی خطرناک ''نتائج'' کا حامل ہوسکتا ہے۔ امریکی معیشت بھی عدم توازن اور عدمِ استحکام کا شکار ہے۔ دوسروں کے خلاف اقدامات کے ذریعے امریکی معیشت کو مضبوط نہیں کیا جاسکتا۔

بہت سے ماہرین کا کہنا ہے کہ میکسیکو، چین اور کینیڈا وغیرہ کے خلاف ٹیرف نافذ کرنا دراصل ووٹ بینک کو مضبوط رکھنے کی حکمتِ عملی بھی ہے۔ امریکا میں کئی ریاستیں ایسی ہیں جو مینوفیکچرنگ سیکٹر کے حوالے سے غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔ اِن ریاستوں کی کمائی میں اضافہ ہوسکتا ہے اگر درآمدات پر ڈیوٹی عائد کی جائے یا بڑھائی جائے۔ حکمتِ عملی چاہے کوئی بھی ہو، جو کچھ ٹرمپ چاہتے ہیں، وہ آسانی سے حاصل نہیں کر پائیں گے۔ چائنیز اکیڈمی آف سوشل سائنسز کے ماہر ایل وی ژیانگ کہتے ہیں کہ شمالی امریکا میں صنعتیں بالعموم اور گاڑیوں کا شعبہ بالخصوص آپس میں بہت اچھی طرح جُڑا ہوا ہے۔ اگر ٹیرف عائد کیا جائے گا تو بڑے پیمانے پر خرابی پیدا ہوگی۔

ایل وی ژیانگ کہتے ہیں کہ امریکی صدر اپنے ملک کی آٹو انڈسٹری کے سنہرے دور کا احیا چاہتے ہیں۔ اب ایسا ممکن نہیں۔ ٹیکنالوجیز کا دھماکا ہو چکا ہے، انقلاب برپا ہو چکا ہے۔ امریکا میں اب اجرتیں بہت زیادہ ہیں اور خام مال بھی بہت مہنگا پڑتا ہے۔ دوسری طرف چین اور جنوبی کوریا میں گاڑیوں کی تیاری کی لاگت خاصی کم ہے۔ امریکا میں اجرتیں اس لیے زیادہ ہیں کہ ہنرمند محنت کشوں کی کمی ہے۔ باہر سے افرادی قوت منگوانے کی صورت میں زیادہ معاوضہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ ایسے میں امریکی آٹو انڈسٹری کس طور کسی بھی ملک کی گاڑیوں سے مقابلہ کرسکتی ہے۔ امریکا میں مہنگائی کی شرح بھی مستقل بڑھتی رہتی ہے۔ لاگت میں ہونے والے اضافے کو کس طور روکا جاسکتا ہے؟ ڈونلڈ ٹرمپ اِن تمام معاملات کے بارے میں سوچنے کے عادی نہیں۔

ایل وی ژیانگ کا یہ بھی کہنا ہے کہ اگر ڈونلڈ ٹرمپ نے امریکا کے بڑے تجارتی پارٹنرز کے خلاف ٹیرف عائد کرنے کے معاملے میں سوچے سمجھے بغیر آگے بڑھنے کی کوشش کی تو اِس کے نتیجے میں پورے شمالی امریکا کا معاشی ڈھانچا ہی شدید خرابیوں سے دوچار ہوگا۔

شنگھائی جیاؤ تونگ یونیورسٹی کی وزٹنگ محقق لِن ژیوپنگ کا کہنا ہے کہ آٹو سیکٹر سے جو یونٹس میکسیکو اور کینیڈا منتقل کیے جاچکے ہیں، انہیں دوبارہ امریکی سرزمین پر منتقل کرنا ایسا آسان نہیں۔ اس حوالے سے کی جانے والی کسی بھی کوشش کو غیر حقیقت پسندانہ ہی قرار دیا جائے گا۔ لِن ژیوپنگ کہتی ہیں کہ امریکی آٹو انڈسٹری میں تربیت یافتہ کاریگر کو فی گھنٹہ ۳۵ ڈالر تک اجرت دی جاتی ہے جبکہ میکسیکو میں یہ اجرت ۴ ڈالر کے مساوی ہے۔ ایسے میں امریکی معیشت عالمی سطح پر پائی جانے والی مسابقت کا سامنا کیسے کرسکتی ہے۔

لِن کا کہنا ہے کہ مستقبل میں امریکی مینوفیکچرنگ سیکٹر بلند لاگت، بلند قیمت اور بلند شرحِ منافع کے پیراڈائم کے تحت کام کرے گا۔ چند ہی صنعتیں امریکا میں رہ پائیں گی۔ بڑھتی ہوئی لاگت امریکی معیشت کو عالمی منڈی میں مسابقت کے قابل چھوڑے گی ہی نہیں۔ اگر امریکی حکومت چاہتی ہے کہ صنعتیں ملک میں رہیں تو بہت بڑے پیمانے پر زرِاعانت کا اہتمام کرنا پڑے گا۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو پورا صنعتی ڈھانچا ڈھے جائے گا۔

(ترجمہ: ابوصباحت)

"Twists and turns: Trump's fluctuating trade policy threatens global economic stability". ("China Global TV Network ". March 7, 2025)

# 'وحدۃ الظل': فلسطینی جانبازوں کا خُفیہ ترین یُونٹ

ضیا چترالی

'وحدۃ الظل' کا نام اردو میڈیا میں پہلی بار سننے میں آیا ہے۔ بی بی سی نے اپنی طرف سے اس کا الٹا سیدھا تعارف کرایا ہے۔ آیئے اس خفیہ یونٹ کے بارے میں مکمل اور بالکل درست معلومات آپ کے سامنے رکھتے ہیں:

اس خفیہ یونٹ کو القسام بریگیڈ نے انتہائی حساس مشنز کے لیے قائم کیا ہے اور اس کا مقصد غزہ میں اسرائیلی قیدیوں کی حفاظت کرنا اور انہیں ''نامعلوم جگہ'' رکھنا ہے، تاکہ اسرائیل کے ساتھ قیدیوں کے تبادلے کی کامیاب ڈیل ممکن بنائی جاسکی۔ اس یونٹ کی نگرانی کی ذمہ داری براہ راست کمانڈر اعلیٰ کے سپرد ہوتی ہے اور اس یونٹ کے وجود کا انکشاف پہلی بار ۲۰۱۶ء میں اس کے قیام کے ۱۰ سال بعد ہوا، جب اس نے اسرائیلی فوجی گیلا دشالیط کے تحفظ کی ذمہ داری سنبھالی تھی، جو کہ قیدیوں کے ایک کامیاب تبادلے کے معاہدے کے نتیجے میں رہا ہوا۔ اس کے بعد سے اس یونٹ کے بارے میں کوئی معلومات دستیاب نہیں تھیں، حتیٰ کہ جولائی ۲۰۲۲ء کے آخر میں القسام ترجمان نے اعلان کیا کہ ''وحدۃ الظل'' کا ایک رکن شہید ہوگیا اور ۳ دیگر زخمی ہوگئے ہیں، جب اسرائیل نے ۲۰۲۱ء میں غزہ پر حملہ کرتے ہوئے ایک اسرائیلی قیدی کو رکھنے والی جگہ کو نشانہ بنایا تھا۔

''وحدۃ الظل'' کا قیام اس وقت عمل میں لایا گیا جب القسام بریگیڈ نے ''لجان المقاومۃ الشعبیۃ'' اور ''جیش الاسلام'' کے ساتھ مل کر جون ۲۰۰۶ء میں گیلا دشالیط کو اغوا کیا۔ اس کے بعد ''وحدۃ الظل'' کو اسیر فوجی کی حفاظت کی ذمہ داری دی گئی اور یہ یونٹ القسام بریگیڈ کا سب سے اہم اور سب سے خفیہ فوجی یونٹس میں سے ایک بن گیا۔ اب اسے ''خصوصی مشن یونٹ'' کے طور پر جانا جاتا ہے، ۲۰۱۶ء کے آغاز تک یہ مکمل طور پر خفیہ رہا، اس وقت اس کا انکشاف ایک مختصر ویڈیو کے ذریعے کیا گیا، جو حماس کے غزہ میں قائم ''قناۃ الأقصیٰ'' ٹی وی چینل پر نشر ہوئی۔

## اہم مراحل

اس یونٹ نے اسرائیلی فوجی گیلا دشالیط کو موساد اور اس کے ایجنٹوں کی نظروں سے تقریباً پانچ سال تک چھپائے رکھا، یہاں تک کہ مزاحمت نے اسرائیل کو ''وفاء الأحرار'' کے معاہدے کو تسلیم کرنے پر مجبور کردیا، جسے عوامی طور پر ''شالیط معاہدہ'' کہا جاتا ہے۔ اس معاہدے کے نتیجے میں ۱۰۵۰ فلسطینی قیدیوں کو اسرائیلی جیلوں سے آزاد کیا گیا۔ اس کے بعد، یونٹ کو ۲۰۱۴ء سے چار اسرائیلی قیدیوں کو حراست میں رکھنے کی ذمہ داری دی گئی، جن میں دو فوجی شامل ہیں، جنہیں القسام بریگیڈ نے ۲۰۱۴ء کی تیسری اسرائیلی جنگ کے دوران غزہ میں قید کیا تھا، جسے مزاحمت ''معرکۃ العصف المأول'' کہتی ہے۔ ان کے علاوہ دو دیگر اسرائیلی شہری غزہ میں پراسرار حالات میں داخل ہوئے اور گرفتار ہوگئے۔

القسام بریگیڈ کے لیے قیدیوں کا معاملہ بہت اہمیت رکھتا

ہے۔ وہ کہتی ہے کہ ''وحدۃ الظل'' کو دراصل فلسطینی قیدیوں کی آزادی کے لیے عملی اقدامات کے طور پر قائم کیا گیا تھا اور یہ یونٹ اس وقت تک اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکے گی جب تک کہ ''اسرائیلی جیلوں سے تمام قیدیوں کو آزاد نہیں کر دیا جاتا''۔ القسام بریگیڈ نے اعلان کیا ہے کہ یونٹ اس بات پر کاربند ہے کہ ''دشمن کے قیدیوں کے ساتھ عزت و احترام کا سلوک کرنا ہے، جیسا کہ اسلام کا حکم ہے اور انہیں مکمل دیکھ بھال فراہم کرنی ہے، ساتھ ہی دشمن کے ہاتھوں مجاہدین کے قیدیوں کے ساتھ سلوک کو مدنظر رکھنا بھی ضروری ہے''۔

۷/اکتوبر ۲۰۲۳ء کو حماس کی جانب سے اسرائیل پر ''طوفان الاقصیٰ'' کے حملے کے بعد، اس یونٹ کو ۲۰۰ سے ۲۵۰/اسرائیلی قیدیوں کی حفاظت اور ان کی دیکھ بھال کا فریضہ تفویض کیا گیا۔ اسرائیلی قیدی یوخباد لیفشیتز، کو انسانی بنیادوں پر ۱۵/دن قید رہنے کے بعد رہا ہوئی، نے کہا کہ اس اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا گیا اور وہاں ایک نرس موجود تھی، جو زخمیوں کا علاج کرتی تھی اور ایک ڈاکٹر ہر دو دن بعد قیدیوں کا معائنہ کرنے آتا تھا۔ اس کے علاوہ، اس نے بتایا کہ خواتین قیدیوں کی دیکھ بھال کے لیے مخصوص خواتین تھیں، کیونکہ وہ ان کی ضروریات کو بہتر سمجھتی تھیں اور یونٹ نے قیدیوں کی صفائی اور صحت کا بہت خیال رکھا۔

## ارکان کے انتخاب کے معیارات

مزاحمت کا کہنا ہے کہ ''وحدۃ الظل'' کے ارکان کو منتخب کرنے کا عمل قسّام کی تمام بریگیڈز اور جنگی دستوں کے ذریعے بڑی احتیاط سے کیا جاتا ہے اور اس کے لیے مخصوص معیارات ہیں، جنہیں ''سنہری توازن'' کا نام دیا جاتا ہے۔ اعلیٰ اخلاقی معیار کے ان ارکان کو مختلف امتحانات سے گزارا جاتا ہے، جن میں براہ راست اور بالواسطہ دونوں قسم کے ٹیسٹ شامل ہیں اور انہیں اپنی سیکورٹی اور فوجی صلاحیتوں کو بڑھانے کے لیے خصوصی تربیت دی جاتی ہے۔

یہ معیارات اور خصوصیات درج ذیل ہیں:

۱۔ مسئلہ فلسطین اور مزاحمتی منصوبے کے لیے گہری وابستگی۔
۲۔ قربانی اور ایثار کی شدید خواہش۔
۳۔ ہنگامی حالات اور بحرانوں میں بہترین فیصلے کرنے کی صلاحیت اور ذہانت۔
۴۔ خطرات کو محسوس کرنے کی اعلیٰ صلاحیت۔
۵۔ ایک خفیہ، رازدار شخصیت کا حامل اور ہر بات میں مکمل محتاط۔
۶۔ انفرادیت کی حامل سیکورٹی اور فوجی صلاحیتیں۔

## شہداء

جانبازوں کے ۵ مشہور شہیدوں نے اس یونٹ میں کام کیا ہے اور انہیں ۲۰۰۸ء سے اسرائیلی حملوں میں شہادت نصیب ہوئی۔ ان کے کاموں کے بارے میں کسی کو بھی اس وقت تک علم نہیں تھا جب تک کہ القسام بریگیڈ نے ان کا انکشاف نہیں کیا اور کہا کہ وہ شالیط کو چھپانے اور پانچ سال تک اس کی حراست کے آپریشن میں گہری وابستگی رکھتے تھے۔ القسام بریگیڈ نے کہا کہ ان کا جہاد اندھیرے پردے کے پیچھے تھا اور لوگوں کے درمیان وہ اپنی معمول کی زندگی گزارتے تھے، آپ کو ایسا نہیں لگتا تھا کہ وہ کوئی راز چھپائے ہوئے ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے مسلسل صہیونی سیکورٹی ایجنسیوں کو شکست دی، جو اپنے قیدی (شالیط) کو تلاش کرنے میں ناکام ہوگئی تھیں۔۔۔ وہ ''وحدۃ الظل'' کے ہیرو تھے اور وہ قائدین میدان تھے:

## سامی الحمایدۃ

سامی الحمایدۃ ۱۸/جنوری ۱۹۷۵ء کو ایک پناہ گزین خاندان میں پیدا ہوئے، جن کا خاندانی تعلق فلسطین کے شہر رملہ سے تھا۔ ان کا خاندان رفح کے پناہ گزین کیمپ میں مقیم تھا، جو جنوبی غزہ میں واقع ہے۔ ''وحدۃ الظل'' میں ان کی رکنیت کے ساتھ ساتھ وہ ''وحدہ مکافحۃ الارھاب'' میں بھی شامل تھے، جو سرنگوں کی کھدائی میں مہارت رکھتی تھی۔ وہ ۲۰۰۸ء میں ایک اسرائیلی جنگی طیارے کے فضائی حملے میں شہید ہوئے۔

## عبداللہ لبد

عبداللہ لبد ۱۹۶۸ء میں غزہ کے مغربی علاقے میں واقع الشاطئ پناہ گزین کیمپ میں پیدا ہوئے، جہاں ان کے والدین کو ۱۹۴۸ء کی نکبہ کے دوران شہر المجدل سے جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ وہ ۲۰۰۰ء میں انتفاضہ الاقصیٰ کے آغاز پر القسام بریگیڈ میں شامل ہوئے اور ان کا کردار خاص طور پر اسلحہ سازی کے شعبے میں نمایاں رہا۔ وہ اپنے بھائی اسماعیل اور شہید محمد الدیہ کے ساتھ ۲۰۱۱ء میں اسرائیلی فضائی حملے میں شہید ہوئے۔

## خالد ابوبکرۃ

خالد ابوبکرہ جنوبی غزہ کے شہر خان یونس میں مقیم تھے اور ان کے خاندان کی جڑیں مقبوضہ شہر بیر السبع سے جڑی ہوئی ہیں۔ وہ دھماکہ خیز مواد کی تخلیق اور سرنگوں کی کھدائی میں ماہر تھے۔ یکم نومبر ۲۰۱۳ء کی رات کو ایک سرنگ میں محمد رشید داؤد اور محمد عصام القصاص کے ساتھ ایک اسرائیلی فوجی یونٹ کے ساتھ ہونے والی جھڑپ کے دوران شہید ہوئے۔ اس آپریشن کو قسّام نے ''بوابۃ المجھول'' کا نام دیا تھا۔

## محمد رشید داؤد

محمد رشید داؤد ۱۹۸۷ء میں خان یونس کے ''حي الأمل'' علاقے میں پیدا ہوئے اور القسام بریگیڈ کے ''یونٹ آف آرٹلری'' میں سرگرم رہے۔ وہ بھی ''بوابۃ المجھول'' آپریشن میں شہید ہوئے۔

## عبدالرحمٰن المباشر

عبدالرحمٰن المباشر خان یونس کے پناہ گزین کیمپ میں پیدا ہوئے اور ۲۰۱۵ء میں مزاحمت کے دوران ایک سرنگ کے منہدم ہونے کے نتیجے میں شہید ہوگئے۔

القسام بریگیڈ نے ''وحدۃ الظل'' کے آخری شہید کا نام ''سیکورٹی وجوہات'' کی بنا پر ظاہر نہ کرنے کا فیصلہ کیا، صرف یہ بتایا کہ وہ مئی ۲۰۲۱ء میں غزہ پر اسرائیلی حملے کے دوران شہید ہوئے۔

اس یونٹ کو داد دیجیے کہ اسرائیل، امریکا اور برطانیہ سمیت تمام قوتوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا، مگر ان کے چھپائے ہوئے قیدیوں کا سراغ نہ لگا سکے۔

(بحوالہ: ماہنامہ ''براہ راست''۔ مارچ ۲۰۲۵ء)

●●●

## بقیہ: امریکا اسرائیل تعلقات کا کمزور مستقبل؟

جو کچھ امریکا نے یوکرین کے ساتھ کیا ہے، وہ ایسا نہیں کہ آسانی سے سمجھ میں نہ آسکے۔ جب امریکی ترجیحات تبدیل ہوئیں تب یوکرین کے لیے امداد کے سوتے بھی سُوکھتے گئے۔ اسرائیلی قیادت ایک بڑی غلطی کر رہی ہے۔ اگر وہ امریکی یہودیوں کی حمایت کو اہم نہیں گردان رہی تو پھر کل کو امریکی قیادت بھی اس معاملے میں اُس کے لیے کچھ زیادہ کرنے کی پوزیشن میں نہ ہوگی۔

اسرائیل اس وقت جس نوعیت کی سیاسی تبدیلیوں سے گزر رہا ہے یا جن سیاسی تبدیلیوں کی دہلیز پر کھڑا ہے اُنہیں دیکھتے ہوئے بہت آسانی سے یہ سوچا اور کہا جاسکتا ہے کہ وہ بھی اُن اتحادیوں کی صف میں شامل ہوسکتا ہے جنہیں امریکا نے چھوڑ دیا ہے۔ جو کچھ ہنری کسنجر نے کہا تھا اور جو کچھ یوکرین کے ساتھ ہوا ہے، وہ تو یہی کہانی سُنا رہا ہے۔

(مترجم: ابوصباحت)

"US-Israel relations face a fragile future: Abandoning Ukraine is a warning".
("Middle East Monitor". March 5, 2025)

●●●

# قابض اسرائیلی فوج کا نیا سربراہ اور غزہ کا مستقبل

Aziz Mustafa

جنرل ایال زامیر نے اسرائیلی فوج کے کمانڈر کے طور پر اپنے نئے عہدے پر کام کا باقاعدہ آغاز کر دیا ہے، اس عہدے پر ان کا تقرر استعفیٰ دینے والے کمانڈر ہرزی ہلیوی کی جگہ ہوا ہے جو ۷/اکتوبر ۲۰۲۳ء کو حماس کے حملے کا مؤثر جواب دینے میں ناکام رہے اور غزہ جنگ میں اسرائیل کے لیے ان کی کارکردگی بھی تسلی بخش نہیں رہی۔

زامیر نے اسرائیلی فوج میں اہم عہدوں پر کام کیا ہے، جن میں وزارت دفاع کے ڈائریکٹر جنرل، چیف آف اسٹاف کے نائب، جنوبی کمانڈ کے کمانڈر اور وزیر اعظم کے ملٹری سیکرٹری کے عہدے شامل ہیں۔ وہ اس عہدے پر فائز ہونے والے پہلے مِصر اہی یہودی ہیں ان کے والد یمنی نژاد ہیں اور والدہ شامی نسل سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ اس عہدے پر فائز ہونے والے سب سے زیادہ عمر کے جنرل بھی ہیں، ان کی عمر ۵۹ سال ہے۔

زامیر فلسطینی شہریوں کے خلاف اجتماعی سزاؤں کی حمایت کرتے ہیں، جن میں اقتصادی پابندیاں، بجلی کی فراہمی میں کمی، لاک ڈاؤن، خام مال پر پابندیاں اور گاڑیوں کے لیے ایندھن کی فراہمی پر پابندیاں شامل ہیں۔ وہ قتل اور نسل کشی کے حکومتی فیصلوں کی بھی حمایت کرتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ 'عسکریت پسندوں' کو جان بوجھ کر نشانہ بنانا جائز اور قانونی ہے۔

زامیر نے ایک ''ٹارگٹ بینک'' کا خاکہ پیش کیا ہے، جو ان کی آئندہ جارحانہ حکمت عملی کا مرکزی حصہ ہوگا، جس میں وہ مزاحمت کے ''روحانی رہنماؤں'' کو بھی شامل کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ افراد مزاحمت کے فوجی ڈھانچے کا ایک لازمی حصہ ہیں، جس کی بنا پر انہیں جنگ میں جائز اہداف قرار دیا گیا ہے، زامیر ان افراد پر عسکری آپریشنز میں ملوث ہونے کا الزام لگاتے ہیں، چاہے وہ شہریوں کے طور پر ہی سامنے کیوں نہ آئیں۔ ان کے مطابق یہ افراد شہریوں کے طور پر چھپ کر اپنی حفاظت کو یقینی بناتے ہیں۔ یوں زامیر کے نزدیک مزاحمتی گروہوں کے کسی بھی رکن کو نشانہ بنانا جائز ہے۔

اکتوبر ۲۰۲۳ء میں غزہ پر حملے کے آغاز کے بعد سے زامیر نے مقامی دفاعی صنعت پر انحصار بڑھانے اور امریکی گولہ بارود اور سپلائی پر انحصار کم کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے حالانکہ انہوں نے اپنے امریکی ہم منصبوں کے ساتھ مضبوط تعلقات برقرار رکھے ہیں۔ وہ ریاست ہائے متحدہ امریکا سے ہتھیاروں کی خریداری کے ذمہ دار تھے، جن میں جنگی طیارے اور بھاری اسلحہ شامل ہیں لیکن انہوں نے مقامی فوجی پیداوار میں بھی اضافہ کیا۔

وزارت دفاع کے ڈائریکٹر جنرل کے طور پر، زامیر نے غزہ کی جنگ کے ۱۵/مہینوں کے دوران اسرائیلی فوج کو دنیا بھر سے اسلحہ فراہم کرنے کے لیے سیکڑوں طیاروں اور جہازوں پر مشتمل ایک وسیع ہوائی اور بحری سپلائی چین کو مربوط کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے جنگ کے شدت اختیار کرنے اور جب کچھ مغربی ممالک نے اسرائیل پر اسلحہ کی پابندیاں عائد کیں، اس وقت ہتھیاروں کی جاری کمی کو بھی منظم کیا۔ اس بڑے پیمانے پر حاصل کردہ اسلحے میں مختلف اقسام کے ہتھیار، جنگی نظام، ایندھن، پرزے، خام مال اور دیگر فوجی سامان شامل تھا۔

اسرائیلی فوجی سربراہ کے طور پر اپنے تقرر کے بعد جنرل زامیر نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ ۷/اکتوبر کے حملے کی ناکامیوں کی تحقیقات کرنا جنرل اسٹاف کی تحقیقات کے دائرے اور نوعیت کا تعین کرنے کے لیے ضروری ہوگا۔ یہ تحقیقات سینئر فوجی عہدوں پر افراد کی دوبارہ تعیناتی کو متاثر کریں گی، کیونکہ کچھ افسران کو پہلے ہی جوابدہ ٹھہرایا جا چکا ہے جبکہ دوسرے افسران سے توقع کی جا رہی ہے کہ وہ احتساب کا سامنا کریں گے۔ بڑھتی ہوئی توقعات یہ ہیں کہ جنرل زامیر کی تقرری کے نتیجے میں کئی اعلیٰ افسران کی ریٹائرمنٹ ہوگی، جس سے نئے جنرلز اور بریگیڈیئر جنرلز کی راہ ہموار ہوگی جو ترقی کے منتظر ہیں۔

زامیر اس بات کے لیے بھی معروف ہیں کہ وہ اسرائیلی فوج کی کم ہوتی ہوئی افرادی قوت کے بارے میں متنبہ کرتے رہے ہیں۔ وہ ''چھوٹی فوج'' کے نظریے کی سخت مخالفت کرتے ہیں اور اس خیال کو مسترد کرتے ہیں کہ فوج وقت کے ساتھ ایک ہائی ٹیک کمپنی میں تبدیل ہو جانی چاہیے۔ انہوں نے کھل کر کہا ہے کہ فوج کو ۱۰/ہزار اضافی جنگجو دستوں کی ضرورت ہے کیونکہ انتہائی مذہبی (حریدی) فوجیوں کو بھرتی کرنے میں ناکامی ہوئی ہے۔ ان کی ترجیحات میں فوج کی تعداد کو بڑھانا، زمینی فورسز اور مشقوں میں مزید سرمایہ کاری اور ملٹی فرنٹ جنگ کے لیے مقامی پیداوار کی صلاحیتیں بڑھانے کو ترجیح دیتا ہے۔

زامیر کو غزہ کی جنگ کے نتائج کے علاوہ ۱۰/اہم چیلنجوں کا سامنا ہے۔ پہلا چیلنج نئی ٹیم کا انتخاب کرنا ہے، جس میں ان کے نائب اور جنرل اسٹاف شامل ہیں اور یہ سب ایک مختصر مدت میں مکمل کرنا ہے۔ دوسرا چیلنج انتہائی مذہبی افراد کو فوج میں بھرتی کرنا ہے۔ تیسرا چیلنج غزہ میں جنگ بندی کے ممکنہ انہدام اور جنگ کی بحالی کے لیے تیاری کرنا ہے۔ چوتھا چیلنج ایران کے خلاف ایک بے مثال فوجی آپریشن کی منصوبہ بندی ہے، جس میں امریکی حمایت شامل ہے۔ پانچواں چیلنج ۷/اکتوبر کی ناکامیوں کی جاری تحقیقات کو حتمی نتیجے تک پہنچانا ہے۔ زامیر کے لیے چھٹا چیلنج فوج پر عوامی اعتماد کو بحال کرنا ہے، جو ۷/اکتوبر کو ہونے والی تباہ کن ناکامی کے بعد شدید نقصان سے دوچار ہوا تھا۔

ساتواں چیلنج فوج کی افرادی قوت میں اضافے کے لیے اقدامات، خریداری اور عملی منصوبوں کی فعالیت کو مرتب کرنا ہے۔ آٹھواں چیلنج دفاعی بجٹ کی منظوری حاصل کرنا اور وزارت دفاع کے لیے کئی سالوں پر محیط اسٹریٹجک منصوبہ تیار کرنا ہے۔ نواں چیلنج فوجی اسٹریٹجک منصوبہ بندی کی حمایت کرنا، تحقیق و ترقی کے لیے بجٹ میں اضافہ کرنا اور نئے ڈویژنز کے قیام کا جائزہ لینا ہے۔ دسواں اور آخری چیلنج مصنوعی ذہانت، روبوٹکس، فوجی برآمدات کو بڑھانا اور ڈیجیٹلائزیشن کو وسعت دینا ہے۔

میدان جنگ میں، زامیر کو غزہ میں سنگین حالات کا سامنا کرنا پڑے گا، خاص طور پر سیاسی قیادت کی جانب سے حماس کی جگہ ایک متبادل حکومتی ڈھانچہ قائم کرنے میں ناکامی کی وجہ سے جو تقریباً ۲۰ لاکھ فلسطینیوں کا ذمہ دار ہے۔ اس کے نتیجے میں، فوج کی ''فوجی کامیابیاں'' سیاسی فوائد میں تبدیل نہیں ہو سکیں، جس سے ایک مسلسل چیلنج پیدا ہو رہا ہے جو روز بروز اسرائیلی فوجی آپریشنز کے اثرات کو غزہ میں کم کر رہا ہے۔ اسرائیل کو زامیر سے توقع ہے کہ وہ سیاسی رہنماؤں اور عوام سے یہ بات نہیں چھپائیں گے کہ فوج غزہ میں وسائل کے لحاظ سے کس حد تک کمزور ہو رہی ہے، چاہے وہ باقاعدہ ہو یا ریزرو فورسز۔

ایسی صورتحال میں امکان ہے کہ جنرل زامیر سیاسی رہنماؤں پر دباؤ ڈالیں گے تاکہ واضح ترجیحات طے کی جا سکیں۔ حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ اسرائیلی افواج کو غزہ، لبنان اور شام میں تعینات رکھا جائے گا، جبکہ فوجی توجہ مغربی کنارے کی طرف منتقل کی جائے گی۔ اس سے انہیں فوجی ترجیحات اور وسائل کی تقسیم کے بارے میں مشکل فیصلے کرنے پڑیں گے، کیونکہ فوج پہلے ہی افرادی قوت کی کمی کا شکار ہے۔ یہ پہلے ہی واضح ہو چکا ہے کہ اسرائیل کے لیے فوجی یونٹوں کی تعداد میں اضافہ کرنا ضروری ہوگا۔ (مترجم: محمود الحق صدیقی)

"The challenges facing Eyal Zamir: The 24th commander of the occupation army". ("Middle East Monitor". March 7, 2025)

# طوفان الاقصیٰ: محمد الضیف جس نے تاریخ کا رُخ بدل ڈالا

کئی دہائیوں تک جاری رہنے والے جہاد اور مزاحمت کے سفر کے بعد کمانڈر محمد الضیف کی طوفان الاقصیٰ کی جنگ میں شہادت کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ انہوں نے 'طوفان الاقصیٰ' معرکے کی قیادت کی اور ملٹری کونسل میں اپنے بھائیوں کے ساتھ فلسطینی عسکری منظر نامے اور فلسطین کی جدید تاریخ پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہوئے اپنے رب سے جا ملے۔

۳۰ جنوری کی شام ایک ٹیپ شدہ ویڈیو تقریر میں القسام کے ترجمان ابوعبیدہ نے کہا کہ فخر اور غیرت کی تمام نشانیوں کے ساتھ، تمام ضروری طریقہ کار کو مکمل کرنے اور جنگی میدان کے حالات کی طرف سے عائد تمام حفاظتی احتیاطوں سے نمٹنے، ضروری تصدیق اور تمام متعلقہ اقدامات کرتے ہوئے القسام بریگیڈز اعلان کرتا ہے کہ ہمارے عظیم سپوتوں، ہماری قوم اور دنیا میں آزادی اور مزاحمت کی علامت شہید عزالدین القسام بریگیڈز کی جنرل ملٹری کونسل کے سربراہ محمد الضیف اور کونسل کے دیگر ممبران جام شہادت نوش کر چکے ہیں۔

## القسام بریگیڈز کی بانی نسل

نوے کی دہائی سے محمد الضیف کا نام فلسطینی مزاحمت سے جڑا ہوا ہے۔ وہ القسام کے مجاہدین کی پہلی نسل کے جوانوں میں سے ایک تھے۔ وہ بہادری، جرأت اور مزاحمت کی علامت بن گئے، لیکن فلسطینی عسکری منظر نامے میں انہوں نے گہرے اثرات چھوڑے۔

تین دہائیوں سے زائد عرصے تک الضیف نے حماس کے عسکری ونگ القسام بریگیڈز کی قیادت کی۔ انہیں صہیونی دشمن نے شہید کرنے کی بار بار بزدلانہ ناکام کوششیں کیں مگر وہ ہر بار دشمن کو چکمہ دے کر دشمن کو مایوس کر دیتے۔ انہوں نے طوفان الاقصیٰ کی جنگ کا راستہ چنا، اس کا منصوبہ ڈیزائن کیا جس نے قابض دشمن کو ذلیل و رسوا کیا اور اس کے ناقابل شکست ہونے کے گھمنڈ کو پاش پاش کر دیا۔ یہ الضیف کی شاندار حکمت عملی تھی کہ غزہ کے قریب تعینات اسرائیلی فوجی ڈویژن تمام تر اسلحے، جنگی ساز و سامان اور ٹیکنالوجی کے باوجود القسام کے مٹھی بھر جانثاروں کے سامنے ڈھیر ہو گیا تھا۔

## آبائی تعلق

محمد الضیف شہید کا اصل نام محمد دیاب ابراہیم المصری تھا۔ وہ ۱۹۶۵ء میں جنوبی غزہ کی پٹی کے خان یونس پناہ گزین کیمپ میں ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جو ۱۹۴۸ء میں مقبوضہ فلسطینی علاقوں سے بے گھر ہونے کے بعد غزہ کی پٹی کے جنوبی شہر خان یونس کے ایک مہاجر کیمپ میں آباد ہو گیا تھا۔

الضیف کا خاندان ۱۵ افراد پر مشتمل تھا۔ ان کے والد رضائیاں بھرنے کی صنعت میں کام کرتے تھے۔ الضیف نے اپنی ابتدائی اور ثانوی تعلیم خان یونس کیمپ کے اسکولوں میں حاصل کی۔ وہ باقی فلسطینی پناہ گزینوں کی طرح اپنے گھروں، زمینوں اور جائیدادوں سے بے جبری بے دخلی کا صدمہ لے کر پروان چڑھ رہے تھے۔

وہ مزاحمت کے ماحول میں پلے بڑھے اور چھوٹی عمر سے ہی قابض دشمن کی حقیقت اور پناہ گزین کے طور پر سخت حالات سے متاثر ہوئے۔ جس کی وجہ سے وہ غزہ کی اسلامی یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران اسلامی تحریک کی صفوں میں شامل ہو گئے۔ یونیورسٹی میں انہوں نے سائنس کی تعلیم حاصل کی اور حماس کی حامی طلبا تنظیم ''اسلامک بلاک'' کے کارکن بنے۔

## حماس میں شمولیت

محمد الضیف اپنے ابتدائی بچپن سے ہی حماس میں شامل ہوئے اور اس میں ایک سرگرم رکن رہے۔ انہوں نے ۱۹۸۷ء کے آخر میں شروع ہونے والی عظیم انتفاضہ کی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ انہیں قابض اسرائیلی فوج نے غزہ میں ایک چھاپہ مار کارروائی کے دوران گرفتار کر لیا۔ ۱۹۸۹ء کے موسم گرما میں تحریک کے عسکری ونگ میں شمولیت کے الزام میں انہیں جب گرفتار کیا گیا تو اس وقت حماس کی قیادت شیخ صلاح شحادہ کے پاس تھی۔ شحادہ ۲۰۰۲ء کے موسم گرما میں شہید ہو گئے تھے۔ اس وقت حماس کے عسکری ونگ کو ''حماس المجاہدین'' کہا جاتا تھا۔ بعد میں اس کا نام بدل کر ''القسام بریگیڈز'' رکھ دیا گیا۔

۱۹۹۱ء میں قابض اسرائیلی حکام نے الضیف کو رہا کیا تو وہ القسام بریگیڈز کے اولین رکن مقرر ہوئے۔ انہوں نے عسکری آلات کی تشکیل نو کی۔ اس وقت ان کے ساتھ شامل ہونے والے یاسر النمروت، جمیل وادی، ہشام عامر، عبدالرحمٰن حمدان اور محمد عاشور شہید ہو گئے تھے۔

الضیف کئی فدائین کارروائیوں میں حصہ لینے اور قابض افواج کے ساتھ جھڑپوں میں حصہ لینے کے بعد قابض فوج کو مطلوب ترین افراد میں شامل ہوئے۔ تاہم انہوں نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا۔ لہٰذا تاریخ کا سب سے طویل تعاقب ایک چھوٹے اور تنگ جغرافیائی علاقے میں شروع ہوا۔ اس عرصے کے دوران وہ مسلسل اپنی جگہ بدلتے اور دشمن کو چکمہ دیتے رہے۔ دشمن انہیں زندہ یا مردہ پکڑنے کے لیے کوشاں رہے۔

الضیف کا کردار عماد عقل کی قاتلانہ حملے میں شہادت کے بعد نمایاں ہوا، نومبر ۱۹۹۳ء میں ان کا نام فدائین آپریشنز کے سلسلے میں نمایاں تھا۔ عماد عقل کے بعد محمد الضیف کو ''القسام بریگیڈز'' کی قیادت سونپی گئی۔ اس عرصے کے دوران الضیف کئی معیاری کارروائیوں کی منصوبہ بندی اور انجام دینے میں کامیاب رہے۔ وہ مقبوضہ مغربی کنارے تک پہنچنے اور وہاں کئی خودکش سیل بنانے، الخلیل شہر میں کئی خودکش کارروائیوں میں حصہ لینے اور غزہ واپس آنے میں کامیاب رہے۔

انہوں نے ۱۹۹۴ء میں القدس کے قریب بیر نابالہ قصبے میں صہیونی فوجی ناچشون واچسمین کے اغوا کی منصوبہ بندی میں اہم کردار ادا کیا تھا، جسے ان کے اغوا کاروں کے ساتھ ان کے مقام کا انکشاف ہونے کے بعد قتل کر دیا گیا تھا۔

الضیف ایک بندوق اور واچسمین کا شناختی کارڈ لے کر منظر عام پر آئے۔ انہیں مغربی کنارے سے غزہ کی پٹی اسمگل کیا گیا تھا، اور انہوں نے سرخ کوفیہ سے منہ ڈھانپ رکھا تھا۔

جیسے ہی غزہ کی پٹی میں قابض اسرائیل نے مطلوب افراد کے گرد گھیرا تنگ کیا، الضیف نے گرفتاری یا شہید ہونے کے خوف سے غزہ کی پٹی چھوڑنے کی درخواست سے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ ''ہم قابض ریاست کے خلاف مزاحمت کے لیے بنائے گئے ہیں یا تو ہم فتح حاصل کریں گے یا شہادت کے منصب پر فائز ہوں گے''۔

مغربی کنارے میں دھماکہ خیز مواد کے ماہرین میں سے ایک انجینئر یحییٰ عیاش تھے۔ وہ غرب اردن سے غزہ کی پٹی میں آ گئے، جب مغربی کنارے میں ان کے گرد گھیرا تنگ کر دیا گیا تھا۔ الضیف نے دھماکہ خیز مواد کی تیاری میں ان کے تجربے سے استفادہ کیا۔ عیاش کو صہیونی دشمن نے ۱۹۹۶ء کے اوائل میں ایک بوبی ٹریپ فون کے ذریعے شہید کر دیا تھا۔

ضیف نے یحییٰ عیاش کا انتقام لینے کا عزم کیا۔ انہوں حسن سلامہ کو یحییٰ عیاش کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے مغربی کنارے بھیجا جہاں انہوں نے فدائی کارروائیوں کی نگرانی کی۔

۱۹۹۶ء کے موسم بہار میں عیاش کا بدلہ لینے کی کارروائیاں کرنے کے بعد ضیف مکمل طور پر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

صہیونی فوج نے ان کی گرفتاری کے لیے مہم تیز کردی۔ قابض فوج نے غرب اردن میں بھی گرفتاری مہم شروع کی جس میں سیکڑوں رہنماؤں اور کارکنوں کو حراست میں لیا گیا تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ فلسطینی اتھارٹی نے بھی گھر گھر تلاشی کی مہم شروع کی۔ اس نے محمد الضیف کو بھی حراست میں لے لیا۔

اس نے یہ بہانہ کیا کہ چونکہ اسرائیل ان کا تعاقب کر رہا ہے۔ اس لیے انہیں صہیونی بمباری سے بچانا ہے، مگر امریکیوں کی باجگزار فلسطینی اتھارٹی ایک اور چال چل رہی تھی۔ اس وقت اتھارٹی نے امریکی خفیہ ایجنسی کے 'سی آئی اے' کے تفتیش کاروں کو الضیف سے تفتیش کی اجازت دی جنہوں نے محمد الضیف پر دوران حراست بدترین تشدد کیا تھا۔

بعدازاں الضیف غزہ میں پریونٹیو سکیورٹی جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے اور دوبارہ القسام سیل بنانے میں لگ گئے۔ انہوں نے ستمبر ۲۰۰۰ء میں انتفاضہ الاقصیٰ شروع ہونے تک مزید کارروائیاں کرنے کی تیاری شروع کردی۔

۲۰۰۱ء میں قابض حکام کی طرف سے الشیخ صلاح شحادہ کی رہائی کے ساتھ ہی ضیف نے فوجی ساز وسامان کی قیادت الشیخ شحادہ کو سونپ دی، کیونکہ شحادہ نے ضیف کو بٹالین کی فوجی صنعتوں کی ذمہ داری سونپ دی تھی جس میں انہوں نے ترقی کی اور اس میں مہارت حاصل کی۔

انتفاضہ شروع ہونے کے ایک سال بعد الضیف کو پہلی ناکام قاتلانہ کارروائی کا نشانہ بنایا گیا۔ ۲۲ر اکتوبر ۲۰۰۴ء کو کی گئی اس کارروائی میں ان کے ساتھی عدنان الغول شہید ہو گئے۔ وہ القسام بریگیڈز میں دھماکہ خیز مواد کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ حملے میں ان کا بیٹا بلال بھی شہید ہو گیا۔ ایک صہیونی طیارے نے ''جر الدیک'' قصبے میں ان پر میزائل داغا جس میں عدنان الغول اور ان کا بیٹا بلال شہید اور الضیف معجزانہ طور پر بچ گئے تھے۔

## فوجی قیادت

۲۰۰۲ء کے موسم گرما میں صلاح شحادہ کی شہادت کے بعد تحریک کی قیادت نے الضیف کو عسکری امور کی قیادت کی ذمہ داری واپس کردی۔

۲۶ر ستمبر ۲۰۰۲ء کو صلاح شحادہ کی شہادت کے تین ماہ بعد الضیف دوسری قاتلانہ کوشش میں بھی بچ گئے جب کہ ان کے دو ساتھی شہید اور متعدد زخمی ہو گئے۔

فلسطینی ذرائع نے بتایا کہ الضیف کو تیسری مرتبہ قاتلانہ حملے کا نشانہ بنایا گیا جب ۲۰۰۶ء کے موسم گرما میں اسرائیلی فوجی گیلاد شالیت کی گرفتاری کے بعد اسرائیلی فوجی آپریشن کے دوران ایک گھر پر بمباری کی گئی، جہاں یہ کہا گیا کہ وہ شدید زخمی ہو گئے تھے تاہم القسام بریگیڈز نے اس کی تصدیق نہیں کی۔

کمان سنبھالنے کے بعد سے الضیف نے قابض اسرائیلی دشمن کے خلاف متعدد خودکش کارروائیوں کی ہدایت کی۔ ان کا شمار حماس کی عسکری صلاحیتوں کو فروغ دینے میں سب سے نمایاں انجینئروں میں ہونے لگا۔ انہوں نے مقامی سطح پر راکٹ سازی اور فوجی سرنگوں کا نیٹ ورک قائم کرنے کی ایک نئی جنگی ترکیب اختیار کی۔

## طوفان الاقصیٰ کی قیادت

۷ر اکتوبر ۲۰۲۳ء کو الضیف نے طوفان الاقصیٰ کی جنگ کا آغاز کیا۔ انہوں نے اس آپریشن کی خود نگرانی کی۔ اس کے بعد میدان میں اُتر گئے اور شہادت تک دشمن سے لڑتے رہے۔

طوفان الاقصیٰ کی کئی ایک وجوہات تھیں۔ ان میں قابض صہیونی دشمن کا توسیع پسندانہ اور غاصبانہ طرز عمل، تنازعات کے حل کے بجائے فلسطین پر قبضے کی سازشیں کرنا، القدس اور مقدس مقامات پر صہیونی اجارہ داری اور حاکمیت مسلط کرنا، مسجد اقصیٰ کی زمانی اور مکانی تقسیم کی سازشیں تیار کرنا اور اس کی جگہ ہیکل سلیمانی کا قیام اہم وجوہات تھیں۔

## ناکام قتل اور آہنی عزم

اگرچہ اسرائیل نے محمد ضیف کے خلاف قتل کی کئی کوششیں کیں، لیکن وہ ان سب میں بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے۔ ان میں سے کچھ حملوں میں انہیں شدید چوٹیں بھی آئیں۔ ان میں سے سب سے خطرناک کوشش ۲۰۱۴ء میں غزہ پر اسرائیلی جارحیت کے دوران ہوئی، جب قابض طیاروں نے ان کے گھر کو نشانہ بنایا۔ اس جارحیت میں ان کی اہلیہ اور بیٹا شہید ہو گئے تھے لیکن الضیف ملبے کے نیچے سے نکل کر ایک بار پھر میدان کارزار میں پہنچ گئے۔

## جنگ میں موجود ایک شیڈو لیڈر

محمد الضیف میڈیا میں بہت کم دکھائی دیے۔ ان کے بارے میں صرف چند آڈیو ریکارڈنگز معلوم ہوئی ہیں، لیکن وہ قابض دشمن کے ساتھ ہر محاذ آرائی میں پیش پیش رہتے، کیونکہ انہیں فوجی حکمت عملیوں کے پیچھے ماسٹر مائنڈ کے طور پر دیکھا جاتا ہے جس نے قابض ریاست کے خلاف مزاحمت اور جنگ کی نوعیت کو بدل کر رکھ دیا تھا۔

۲۰۲۱ء میں ''سیف القدس'' کی جنگ کے دوران یروشلم اور مسجد اقصیٰ میں اسرائیلی حملوں کے جواب میں تل ابیب کو میزائلوں سے نشانہ بنانے کی حکمت عملی کے پیچھے الضیف کا ہاتھ تھا، جس نے ایک نئی ڈیٹرنس کو نافذ کیا۔

## اسرائیل کا نمبر ون دشمن

کئی دہائیوں سے قابض اسرائیل نے محمد ضیف کو اپنی مطلوب افراد فہرست میں سرفہرست رکھا۔ انہیں صہیونی ریاست کی سلامتی کے لیے خطرہ بننے والی سب سے خطرناک فلسطینی شخصیت تصور کیا جاتا تھا۔ تمام تر انٹیلی جنس کوششوں کے باوجود قابض دشمن ان تک پہنچنے میں ناکام رہا، جس کی وجہ سے وہ ایک افسانوی اور خوفناک خواب بن کر رہ گئے۔ ان کی وجہ سے دشمن کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ وہ دشمن کے ہاتھ زندہ تو نہ لگے، مگر اپنی شہادت کی تمنا پوری کرتے ہوئے دشمن کی جارحیت کا نشانہ بن کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے تھے۔

قائد محمد الضیف ایک شہید کے طور پر رخصت ہو گئے، لیکن ان کی بھرپور تاریخ اور اور مسئلہ فلسطین پر ان کے اثرات ان کے فنگر پرنٹس کی طرح موجود رہیں گے۔ وہ فلسطینی مزاحمت، ثابت قدمی اور بہادری کی ایک مثال کے طور پر دیکھے جائیں گے اور ان کا نام ہمیشہ حریت پسندوں اور زندہ ضمیر انسانوں کے لیے حوصلے، عزم اور طاقت کا ذریعہ ثابت ہوگا۔

(بحوالہ: ''مرکز اطلاعات فلسطین''۔ یکم فروری ۲۰۲۵ء)


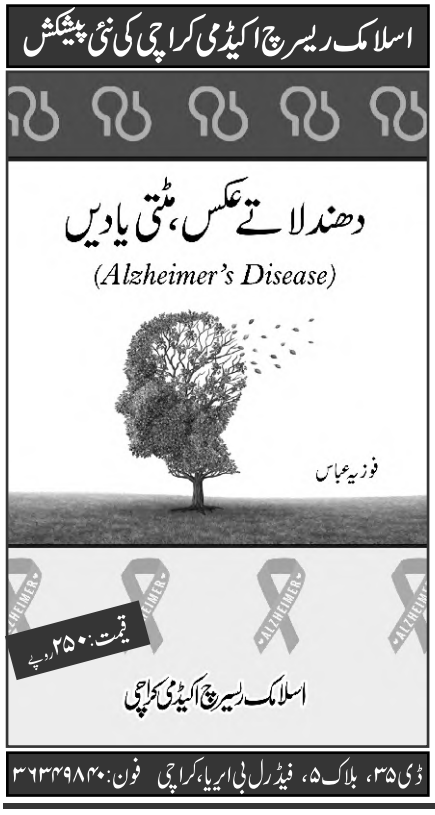

# ٹیسلا اور امریکا کا زوال

Stephan Richter

جو کچھ امریکی صدر ٹرمپ کرنا چاہتے ہیں، اُس کی راہ میں خود اُن کا وجود حائل ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ٹرمپ زمینی حقیقتوں کو یکسر نظر انداز کرنے کے موڈ میں ہیں اور اس معاملے میں کسی کی رائے سُننے، مشورہ ماننے کو تیار نہیں۔ ٹیسلا کا شمار امریکا ہی نہیں بلکہ دنیا کے بڑے آٹو میکرز میں ہوتا ہے۔ اس کے سربراہ ایلون مسک ہیں جو اس وقت امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کا دایاں بازو بنے ہوئے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ٹیسلا کو دھچکے لگ رہے ہیں۔ خود ایلون مسک نے بھی تسلیم کیا ہے کہ امریکی صدر نے انہیں سرکاری اداروں اور محکموں کی کارکردگی کا جائزہ لے کر اخراجات کم کرنے سے متعلق ادارے DOGE کی سربراہی سونپ کر مشکلات سے دوچار کر دیا ہے کیونکہ وہ ٹیسلا کے معاملات پر خاطر خواہ حد تک توجہ نہیں دے پا رہے۔

ڈونلڈ ٹرمپ اور ایلون مسک نے مل کر دنیا کی سب سے زیادہ آتش گیر ''من ترا حاجی بگویم، تو مرا حاجی بگو سوسائٹی'' تشکیل دی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو وقفے وقفے سے سراہتے رہتے ہیں۔ دنیا کو یہ تاثر یا دھوکا دینے کی کوشش کی جارہی ہے کہ اِس وقت اُن سے زیادہ ذہین اور معاملہ فہم کوئی نہیں اور یہ کہ اُن کی قیادت میں امریکا مزید اتنی ترقی کر لے گا کہ دودھ اور شہد کی نہریں بہنے لگیں گی۔ صدر ٹرمپ کا جھکاؤ ایلون مسک کی طرف کچھ زیادہ ہے۔ اِتنا جھکاؤ خرابیاں پیدا کرتا ہے اور کر رہا ہے۔

حال ہی میں کانگریس میں تقریر کرتے ہوئے صدر ٹرمپ نے ایلون مسک کے حوالے سے کہا کہ اُنہیں فلاں کام نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ''انہیں یہ کام نہیں کرنا چاہیے تھا'' جیسے الفاظ سُن کر لوگوں کو محسوس ہوا کہ شاید وہ اپنے آپ سے کہہ رہے ہیں کہ اُنہیں دوسری بار امریکا کا صدر بننے سے گریز کرنا چاہیے تھا!

ڈونلڈ ٹرمپ اور ایلون مسک کے تعلق، دوستی یا محبت کے بارے میں عالمگیر سطح پر معاملہ یہ ہے کہ جتنی منہ اُتنی باتیں۔ مبصرین اور تجزیہ کار اپنے جائزوں میں طرح طرح کی پیش گوئیاں کر رہے ہیں۔ کسی کا خیال ہے کہ یہ دوستی امریکا کے لیے انتہائی خطرناک ثابت ہوگی۔ کسی کا اندازہ ہے کہ اگر امریکا کو آگے بڑھنا ہے تو ٹرمپ اور مسک کے تعلق کو ایک حد میں رہنا ہوگا۔ عالمگیر سطح پر یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ اس تعلق سے ٹرمپ کا بھلا ہوگا نہ مسک کا۔ ٹیسلا کے شیئرز کی ویلیو گر رہی ہے۔ مارکیٹ میں اس ادارے کی ساکھ داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ اب ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا ٹیسلا کی کاروباری حیثیت کے گراف کا گرنا امریکا کے لیے کوئی واضح انتباہ ہے، قدرت کا خفیہ اشارا ہے۔ امریکا واحد سپر پاور ہے مگر یہ اسٹیٹس برائے نام رہ گیا ہے۔ امریکا کی ساری برتری اس لیے دکھائی دے رہی ہے کہ اُس نے تمام عالمی اداروں کو، یورپ کے ساتھ مل کر، ایک لڑی میں پرو رکھا ہے اور اِس لڑی کا سرا تھام رکھا ہے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ امریکا نے عالمی سیاسی و معاشی نظام اور مالیاتی نظام دونوں کو اپنی مٹھی میں لے رکھا ہے۔

ایک وقت تھا جب امریکا اور ٹیسلا کو ورلڈ بیٹرز سمجھا جاتا ہے یعنی دونوں نے ایک دنیا کو پچھاڑنے کی ٹھان رکھی تھی اور اس حوالے سے بھرپور کامیابی مل بھی رہی تھی۔ امریکا عالمی سیاست و معیشت میں دوبارہ بھرپور غلبہ حاصل کرنے کے لیے بے تاب تھا۔ اُس نے اسٹریٹجک معاملات کو بھی اپنی مٹھی میں بھینچے رکھنے کے لیے ہر کارڈ کھیلنے کا سوچ لیا تھا اور یہی حال کاروباری دنیا میں ٹیسلا کا تھا۔ انہوں نے ٹیسلا کو دنیا کا نمبر ون آٹو میکنگ ادارہ بنانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرنے کی قسم کھالی تھی۔ تین ماہ کے دوران بہت کچھ بدل گیا ہے اور ٹیسلا کے لیے تو جیسے سبھی کچھ بدل گیا ہے۔ ان تین ماہ کے دوران ٹیسلا کے شیئرز کی مارکیٹ ویلیو میں ۵۰ فیصد تک گراوٹ آچکی ہے۔ جس امریکا کا نظم و نسق ٹرمپ اور مسک نے سنبھال رکھا ہے، اُس کے لیے یہ کوئی اچھی علامت یا مبارک اشارا نہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ ٹیسلا پر زوال اس لیے آیا ہے کہ ایلون مسک نے امریکی محکموں اور سرکاری اداروں کی کارکردگی بہتر بنانے کی ذمہ داری سنبھالی ہے۔ ٹیسلا کے لیے معاملات تو ٹرمپ کے منتخب ہونے سے بہت پہلے ہی بگڑنے لگے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ ایلون مسک نے اپنی کاروباری سلطنت کو مضبوط بنانے ہی کے لیے ڈونلڈ ٹرمپ کا ہاتھ تھاما ہو۔ معاملہ صرف اتنا ہے کہ ایلون مسک نے اپنے آپ پر گنجائش سے بہت زیادہ بوجھ لاد لیا ہے۔ سرکاری سطح پر اُن کی سرگرمیاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ اُن کے پاس اب اپنے اداروں کے لیے وقت نہیں رہا۔ اُن کی سرکاری مصروفیت چونکہ غیر معمولی ہوچکی ہے، اس لیے یہ بھی لازم ہے کہ اُن کے کاروباری اداروں کو خاطر خواہ توجہ نہ مل پائے۔ کچھ مدت کے لیے تو ایلون مسک نے ٹیسلا کے شیئرز کی ویلیو میں اضافے کی خاطر چند اقدامات کیے مگر کچھ خاص فائدہ نہیں پہنچ سکا۔ چند ماہ کے دوران ایلون مسک نے کام کم کیا ہے اور بڑھکیں زیادہ ماری ہیں۔ انہوں نے مصنوعی ذہانت، روبوٹکس اور مشین لرننگ کے حوالے سے ایسی باتیں کہیں جن سے یہ عندیہ ملتا تھا کہ وہ اِس شعبے میں کوئی انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں مگر پھر لوگوں نے دیکھا کہ یہ سب کچھ محض زبانی جمع خرچ تھا۔

ایک وقت تھا کہ ٹیسلا کو ٹیکنالوجی کے شعبے میں قائدانہ سا کردار مل چکا تھا۔ دنیا بھر کے ادارے جدت اور ندرت کا اندازہ لگانے کے لیے ٹیسلا کی طرف دیکھا کرتے تھے۔ کہانی یہ ہے کہ پہلے تو ہائی ٹیک کے شعبے میں ٹیسلا میں ٹھہراؤ آیا اور اب معاملہ ختم کی طرف جارہا ہے۔ ایلون مسک کا یہ حال ہے کہ جب سے اُنہوں نے ڈونلڈ ٹرمپ کا ہاتھ تھاما ہے، چین سے تجارت اور ہائی ٹیک میں مسابقت پر اُن کی توجہ رہی نہیں اور اب عمومی تاثر یہ ہے کہ وہ صرف بڑھکیں مار سکتے ہیں یا جی بھر کے بلند بانگ دعوے، اوٹ پٹانگ وعدے کر سکتے ہیں۔ کاروباری دنیا میں مسابقت بڑھتی ہی جارہی ہے اور ایلون مسک، سرکاری مصروفیت کے باعث، اِس طرف توجہ دینے کی پوزیشن میں ہیں ہی نہیں۔ سیاسی سطح پر بہت زیادہ طاقت حاصل کر کے اپنے کاروباری معاملات کو زیادہ سے زیادہ تقویت بہم پہنچانے کی ہوس اور حکمتِ عملی نے ایلون مسک کو عجیب دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے۔

ایلون مسک جس انداز سے اپنے اداروں کو چلا رہے ہیں، وہ انداز انتہائی حیرت انگیز اور بہت حد تک مضحکہ خیز بھی ہے۔ ٹیسلا اور ایلون مسک کے دیگر کاروباری اداروں میں ایلون مسک کے نظم و نسق کے اسٹائل کو زیادہ پسند نہیں کیا جاتا۔ ایلون مسک اور ڈونلڈ ٹرمپ کی بہت گاڑھی محض اس لیے نہیں چھن رہی کہ دونوں بزنس مین ہیں بلکہ یہ گاڑھا پن اس لیے بھی ہے کہ دونوں کا انتظامی انداز یکساں ہے۔ اِسے کبوتر کا سا انداز کہا جاتا ہے۔ ایلون مسک کبوتر کی طرح اڑتے ہیں، جہاں تہاں لوگوں پر بیٹ کر دیتے ہیں اور پھر تیزی سے اڑ کر اپنے جنگلے اور پنجرے کی طرف واپس آجاتے ہیں۔

انتظامی امور کی انجام دہی کا یہ انداز انتہائی خطرناک ہے۔ اِس کے نتیجے میں ٹیسلا کے تمام ایسے سینئر منیجرز یا تو جاچکے ہیں یا پھر جانے کی تیاری کر رہے ہیں جنہیں عزتِ نفس پیاری

ہے۔ دوسری طرف خود ایلون مسک بھی اپنے پیروں پر کلہاڑی مار رہے ہیں یعنی جس سے ذرا سے بھی خفا ہوں، اُسے برطرف کرنے میں دیر نہیں لگا رہے۔ اِس کے نتیجے میں ٹیسلا اور اُن کے دیگر اداروں میں شدید بددلی پھیلی ہوئی ہے۔

معاملات بہت عجیب ہیں۔ اگر ایلون مسک اعلیٰ سطح پر کسی کو برطرف نہ کریں اور اُس کے لیے بے روزگاری کا مسئلہ کھڑا نہ ہو تب بھی ادارے کی بگڑتی ہوئی ساکھ اور مارکیٹ میں طرح طرح کے منفی تصورات اُس کی اپنی ذاتی شناخت اور حیثیت کے لیے بھی انتہائی خطرناک ہیں۔

اب ایسا تاثر مل رہا ہے کہ کبھی ساتھ ساتھ چل کر پوری دنیا کے لیے شدید نوعیت کی مسابقت پیدا کرنے والے امریکا اور ٹیسلا اب مل کر زوال کی طرف رواں ہیں۔ ٹیسلا جیسے انتہائی کامیاب ادارے کے شیئرز کی ویلیو کا اچانک ۵۰ فیصد کی حد تک گر جانا، اِس بات کا واضح اشارا ہے کہ عالمی سطح پر اب امریکا کے لیے بھی معاملات اچھے اور حوصلہ افزا نہیں رہے۔ امریکی قیادت کو اپنی بات منوانے کے لیے بہت زور لگانا پڑے گا۔ دھونس دھمکی اور بلیک میلنگ کل تک چلتی تھی، اب اِس کی زیادہ گنجائش نہیں رہی۔ انتہائی کمزور ممالک کو تو دبوچا جاسکتا ہے مگر ترقی پذیر اور ابھرتی ہوئی معیشتوں کو انگوٹھے کے نیچے رکھنا کسی کے لیے بھی کوئی آسان معاملہ نہیں۔ ٹیسلا کا بحران اس لیے زیادہ خطرناک دکھائی دے رہا ہے کہ باقی دنیا کے ساتھ ساتھ خود امریکا میں بھی اُسے صارفین کی طرف سے بائیکاٹ کا سامنا ہے۔ لوگوں کی سوچ بدل گئی ہے۔

ٹیسلا کے لیے مسابقت اس لیے خطرناک ہوگئی ہے کہ ایک طرف تو اُس نے ٹیکنالوجی کے محاذ پر متوجہ رہنا چھوڑ دیا ہے اور دوسری طرف لاگت کا فیکٹر بھی قیامت ڈھا رہا ہے۔ چین اور جنوبی کوریا کی بنائی ہوئی گاڑیاں جب دنیا کو قدرے کم قیمت پر مل رہی ہیں تو وہ ٹیسلا کی گاڑیاں کیوں خریدے گی؟ یورپ کو بھی چین کی طرف سے شدید نوعیت کی مسابقت کا سامنا ہے۔ ایک جیسی مصنوعات کی قیمت میں ۲۰ فیصد تک کا فرق پایا جاتا ہو تو کوئی احمق ہی ہوگا جو چینی مصنوعات چھوڑ کر امریکی مصنوعات کو اپنائے گا یا یورپ کی طرف دیکھے گا۔

ایسا نہیں ہے کہ مغربی دنیا میں صرف ٹیسلا کو شدید مسابقت اور بائیکاٹ کا سامنا ہے۔ مغربی دنیا کے بہت سے بڑے کاروباری اداروں کو اس وقت کسی نہ کسی حوالے سے بائیکاٹ، مسابقت یا کسی اور چیلنج کا سامنا ہے۔ یہ سب کچھ اچانک نہیں ہوا۔ ایک طرف تو مغربی دنیا کی پالیسیاں خرابی پیدا کر رہی ہیں اور دوسری طرف لاگت کا عنصر بھی مشکلات بڑھا رہا ہے۔ مغربی دنیا میں اجرت بہت زیادہ ہے اور دیگر اخراجات بھی کمتر نہیں۔ ایسے میں کم قیمت والی اشیا عالمی منڈی میں لانا ممکن ہی نہیں رہا۔

جیف بیزوز نے ''واشنگٹن پوسٹ'' میں انتہائی شرمناک ریمارکس کے ذریعے لوگوں کو ناراض کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ لوگ اب ایمیزون سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ آن لائن خریداری کے لیے اب پورٹلز کی کمی نہیں۔ ایمیزون پر جو آئٹم پیش کیے جاتے ہیں، وہی آئٹم دوسرے بہت سے پورٹلز پر کہیں کم قیمت میں دستیاب ہیں۔ فیس بک کو بھی چیلنجز کا سامنا ہے۔ مارک زکر برگ نے حال ہی میں معافی مانگی ہے۔ امریکی سینیٹ میں پیش ہوکر بھی اُنہوں نے والدین کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے معافی مانگی تھی۔

ٹیسلا اور امریکا میں اب ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ ایلون مسک اپنی راہ سے ہٹ چکے ہیں، اُن کی توجہ منتشر ہوچکی ہے جبکہ صدر ٹرمپ اپنے اقتدار کو عالمی امن کی تباہی کے لیے بروئے کار لانے کے معاملے میں ون مین آرمی میں تبدیل کر رہے ہیں۔ صدر ٹرمپ کا وجود عالمی سیاسی و معاشی نظام کے لیے مزید خرابیاں پیدا کر رہا ہے۔ امریکا نے جن جن باتوں کے ذریعے فقید المثال کامیابی حاصل کی، اُن سب کو باری باری ختم کرنا ٹرمپ کا ایجنڈا دکھائی دے رہا ہے۔

تاریخ کے ریکارڈ میں درج ہے کہ رومن شہنشاہ نیرو اُس وقت بانسری بجا رہا تھا جب روم جل رہا تھا۔ کچھ ایسی ہی کیفیت ڈونلڈ ٹرمپ بھی پیدا کرتے دکھائی دے رہے ہیں۔ امریکا کے لیے مشکلات بڑھتی جارہی ہیں اور دوسری طرف ٹرمپ ہیں کہ کسی بھی معاملے میں سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کر رہے۔ اُن کا کھلنڈرا مزاج امریکا کی الجھنوں کو مزید پیچیدہ بنا رہا ہے۔ کچھ باتیں ڈونلڈ ٹرمپ نے فرض کرلی ہیں۔ مثلاً اُن کی ایک رائے یہ ہے کہ امریکا عالمگیریت کے دور کا شہنشاہ ہے مگر ایک دنیا ہے کہ امریکا کو غلط سمجھتی رہی ہے اور اُس سے غلط سلوک روا رکھتی آئی ہے۔ اُن کا یہ بھی خیال ہے کہ امریکا کو تمام معاملات میں خرابی کا حتمی طور پر ذمہ دار قرار دینا کسی بھی طور درست نہیں۔

امریکی صدر جو کچھ بھی کہہ اور کر رہے ہیں، اُس کا بنیادی مقصد اب یہ ہے کہ دنیا نے امریکا کے ساتھ جو کچھ بھی غلط کیا ہے، اُس کا بھگتان کرے۔ ٹرمپ کا کہنا ہے کہ دنیا نے امریکا سے لیا بہت کچھ ہے مگر دیا بہت کم ہے اور یہ کہ اب وقت آگیا ہے کہ امریکا کو وہ سب کچھ ملے جس کا وہ مستحق ہے۔ ٹرمپ چاہتے ہیں کہ کوئی اور ملک اِتنا طاقتور ہوکر نہ ابھرے کہ امریکا کی قائدانہ حیثیت کھٹائی میں پڑ جائے۔

یہ کہنے کی تو اب ضرورت نہیں رہی کہ جو کچھ بھی صدر ٹرمپ کرنا چاہتے ہیں، اُس کی پشت پر کوئی منطق تلاش کرنا آسان کام نہیں۔ ٹیرف ہی کا معاملہ لیجیے۔ ٹرمپ نے تھوڑا سا رونا رو کر آؤ دیکھا نہ تاؤ، میکسیکو، چین اور کینیڈا کے خلاف ٹیرف نافذ کرنے کا اعلان کیا۔ مقصد یہ تھا کہ امریکی مصنوعات کے لیے مارکیٹ میں زیادہ گنجائش پیدا ہو۔ صدر ٹرمپ ٹیرف کے ذریعے دنیا کو سبق سکھانا اور انتقام لینا چاہتے ہیں۔ اس کوشش میں کیا ہوگا، اس کا ٹرمپ کو اندازہ نہیں اور اگر اندازہ ہو بھی تو بظاہر کوئی فکر نہیں۔ دنیا بھر میں عام اشیا کی جو لاگت ہے، اُس سے کہیں زیادہ لاگت امریکا میں ہے۔ یہی سبب ہے کہ امریکا کا درآمدی بل بڑھتا جارہا ہے۔ چین اور دیگر مینوفیکچرنگ جائنٹس مل کر امریکا اور دیگر بڑے، ترقی یافتہ ملکوں کی مارکیٹ پر قبضہ کرچکے ہیں۔ اگر امریکا ٹیرف نافذ کرے گا تو فریقِ ثانی بھی ٹیرف نافذ کرنے کی طرف جائے گا۔ اس کے نتیجے میں امریکا میں عام آدمی کو، جو پہلے ہی مالیاتی مشکلات کا شکار ہے، درآمد شدہ اشیا زیادہ مہنگی پڑیں گی۔

امریکیوں کی اکثریت بھی اس بات کو سمجھتی ہے کہ ڈونلڈ ٹرمپ کی سوچ ایک ہی رخ پر رہتی ہے۔ وہ فکر و نظر کے حوالے سے ساکت و جامد اور قدرے غیر لچکدار ہیں۔ جو کچھ وہ ٹھان لیتے ہیں، اُسے ہر حال میں پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ سوچ انتہائی خطرناک ہے۔ سوال حقیقت پسندی کا ہے۔ اگر ڈونلڈ ٹرمپ ایک بار سوچ لیں کہ کوئی معاملہ درست نہیں تو پھر کوئی نہیں جو اُن سے منوالے کہ وہ معاملہ درست ہے۔ وہ کسی بھی معاملے کے بارے میں جو رائے قائم کرلیتے ہیں، اُسے تبدیل کرنے کی طرف نہیں جاتے۔ پھر وہ حقائق سے بھی رُوگردانی کرتے ہیں۔

ڈونلڈ ٹرمپ کے پیشرَو جو بائیڈن کا مسئلہ یہ تھا کہ اُن کا حافظہ کمزور ہوچکا تھا اور وہ حقائق یاد نہیں رکھ پاتے تھے مگر ڈونلڈ ٹرمپ کا معاملہ اِس سے زیادہ خطرناک ہے کیونکہ وہ حقائق کو نظر انداز کرکے ایسی باتوں کو یاد رکھتے ہیں اور اُن پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن کا حقیقت کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور یوں معاملات بگڑتے ہی چلے جاتے ہیں۔ وہ معاملات کو ایک خاص زاویے سے دیکھتے ہیں اور اُس زاویے کو کبھی تبدیل نہیں کرتے۔ حقائق کچھ اور کہہ رہے ہوں تب بھی

نہیں۔ وہ خود کو حقائق سے مکمل طور پر محفوظ و ممنون رکھتے ہیں!

ڈونلڈ ٹرمپ کے ذہن میں وہ زمانہ بسا ہوا ہے جب مغربی طاقتیں پوری دنیا پر ہر اعتبار سے چھائی ہوئی تھیں یعنی معاملات صرف تجارت تک محدود نہ تھے بلکہ امریکا اور یورپ مل کر پورے پورے خطوں کو غلام بنائے رکھتے تھے۔ ڈونلڈ ٹرمپ اور اُن کے ساتھی مل کر ایک ایسا منصوبہ تیار کرنے میں مصروف ہیں جسے باقی دنیا پر تھوپا جاسکے۔ یہ ماسٹر پلان امریکا کو دوبارہ عظیم بنانے سے متعلق ہے۔ ڈونلڈ ٹرمپ اس حوالے سے امکانات اور گنجائش کے حوالے سے حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرنے کے لیے تیار نہیں۔

ڈونلڈ ٹرمپ اس حقیقت کا ادراک نہیں کر پا رہے کہ جو کچھ بھی وہ باقی دنیا کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں، اُس کے نتیجے میں سب سے زیادہ خطرات اور مشکلات کا سامنا امریکیوں کو کرنا پڑے گا۔ اُن کی پالیسیاں امریکیوں کے لیے سوہانِ روح بن سکتی ہیں۔ تجارت کے معاملات کی خرابی امریکی عوام کی مشکلات میں اضافہ کرے گی۔

دائیں بازو کی طرف جھکاؤ رکھنے والی رومن کیتھولک روایات کی حامل امریکی سپریم کورٹ صدر ٹرمپ اور اُن کے ساتھیوں کے خلاف ایک خاص حد تک ہی جاسکتی ہے۔ ٹرمپ اور اُن کی ٹیم نے مل کر جتنی طاقت حاصل کرلی ہے، اُس کی راہ میں فیصلہ کن حد تک دیوار بننے کی ہمت یا سکت امریکی سپریم کورٹ میں نہیں۔

ٹیسلا نے بھرپور کامیابی دنیا کے لیے نمونہ بن کر حاصل کی تھی۔ یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ سوچ عالمگیر تھی۔ امریکا کی کامیابی کی بھی یہی کہانی تھی۔ جب تک امریکا دنیا کو ساتھ لے کر چلنے کی بات کرتا رہا، تب تک وہ ترقی کرتا رہا۔ جب اُس نے باقی دنیا کو صرف دبوچ کر رکھنے کا سوچنا شروع کیا، تب سے اُس کے لیے انتہائی نوعیت کی مشکلات پیدا ہونے لگیں اور اب یہ سلسلہ تیز تر ہوگیا ہے۔ دنیا کے ساتھ چلنے یا دنیا کو ساتھ لے کر چلنے کی سوچ اگر گم ہوجائے یا دم توڑ دے تو پھر عظمتِ رفتہ کو بحال کرنا تقریباً ناممکن ٹھہرتا ہے۔

ڈونلڈ ٹرمپ اور اُن کی ٹیم نے فیصلہ کیا ہے کہ ساری کی ساری بالادستی صرف امریکا کی ہونی چاہیے۔ وہ ''صرف اور صرف امریکا'' والی سوچ کے حامل ہیں۔ یہ بات اس لیے زیادہ حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہ ساتھ ہی ساتھ ٹرمپ خود کو روس اور چین کے صدور کے ذاتی دوست کی حیثیت میں بھی دیکھتے ہیں۔

چین کے صدر شی جن پنگ اور روس کے صدر ولادیمیر پوٹن کو امریکی ہم منصب کی کوتاہ نظری کا پورا احساس ہے۔ وہ دونوں اس بات کو سمجھتے ہیں کہ ٹرمپ کی پالیسیوں میں زیادہ تسلسل ہے نہ دور اندیشی۔ پختگی کا بھی فقدان ہے۔ ایسے میں وہ صورتحال کا بھرپور فائدہ اٹھانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ امریکا کی کمزور ہوتی ہوئی پوزیشن اور غیر متوازن پالیسیوں سے وہ اپنے اپنے قومی مفادات کے لیے زیادہ سے زیادہ استحکام کی گنجائش پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں یہ حقیقت نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ ٹرمپ اگر چین میں ہوتے تو کسی چھوٹے شہر کے میئر سے زیادہ کا درجہ نہیں پاسکتے تھے۔

روس اور چین مل کر ایسی کیفیت بھی پیدا کرنا چاہتے ہیں جس میں امریکا اور یورپ کا اتحاد ختم ہوجائے۔ روسی صدر یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اُن کے چینی ہم منصب یہ مقصد کس طور حاصل کر پائیں گے۔ بہرکیف، اِس سمت میں کام ہو رہا ہے۔

پوٹن کے لیے ٹرمپ کسی نعمت سے کم نہیں۔ سابق سوویت یونین کے آخری صدر میخائل گورباچوف کے تعمیری کام کے مقابل جو تباہ کن اقدامات پوٹن نے کیے، وہ اُن کے لیے شرم کا باعث تھے۔ ٹرمپ کی بدولت پوٹن کی شرمساری نمایاں حد تک ختم ہوئی ہے۔

ٹیسلا کی ناکامی ایلون مسک کے لیے پریشان کن ضرور ہے مگر اِتنی زیادہ نہیں کہ سب کچھ ہاتھ سے جاتا دکھائی دے۔ اُن کی کاروباری سلطنت بہت بڑی ہے۔ ایکس جیسا بڑا سوشل میڈیا پلیٹ فارم بھی اُنہی کا ہے اور اسپیس ایکس بھی اُن کا ہے۔ دوسرے بہت سے معیاری کاروباری ادارے بھی اُنہی کے ہیں۔ وہ خود بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ اُن کے پاس اب ٹیسلا سے بڑے کاروباری ادارے بھی ہیں۔ اسپیس ایکس کے متعدد راکٹ ٹیک آف کے چند لمحات کے بعد ہی پھٹے ہیں۔ یہ امر بھی ایلون مسک کے لیے کم پریشان کن نہیں۔ روس کی طرح امریکا میں بھی ٹرمپ کے کیمپ میں موجود کاروباری نوگزے پیر جب تک منافع کمار ہے ہیں، تب تک اُنہیں اِس بات کی پروا نہیں کہ معیشت خسارے سے دوچار ہو رہی ہے۔ ٹرمپ کا مزاج ہی ایسا ہے کہ جب تک اُن کے کاروبار میں پیش رفت ہو رہی ہے، تب تک قومی معیشت کی اُنہیں چنداں فکر نہیں۔ یوکرین کے معاملے میں بھی اُنہوں نے اِسی ذہنیت کو بروئے کار لانے پر دھیان دیا ہے۔ جب تک ذاتی فائدہ ہو رہا ہے، تب تک سب کچھ ٹھیک ہے۔

دکھائی یہ دے رہا ہے کہ ٹرمپ اور اُن کی ٹیم نے بہت زیادہ جنونیت کا مظاہرہ کیا ہے مگر درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ جہاں فائدہ ہے بس وہیں توجہ دی جارہی ہے۔ سرکاری اداروں کی املاک فروخت کرنے کی تیاری کی جارہی ہے۔ سرکاری اداروں کے حوالے سے غیر معمولی انتشار پیدا کیا جارہا ہے۔ امریکی محکمہ انصاف کے صدر دفتر کی عمارت کو بھی فروخت کرنے کی تیاری کی جارہی ہے۔ یہ بھی ٹرمپ اور اُن کی ٹیم ہی کا ایجنڈا ہوگا۔ پسماندہ ممالک کی طرح اب امریکا میں بھی اقتدار سے چمٹے ہوئے لوگ سرکاری زمینیں اور عمارتیں خرید کر ذاتی منفعت کے لیے بروئے کار لانے کی راہ پر گامزن ہیں۔

اب ایک بنیادی سوال یہ ہے کہ قانونی طور پر مشکوک سمجھے جانے والے کسی بھی اقدام کے ساتھ ڈونلڈ ٹرمپ بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئے تو زیادہ طاقتور ہوکر ابھریں گے۔ یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ صدر کی حیثیت سے سپریم کورٹ نے اُنہیں استثنیٰ دے رکھا ہے۔

ٹرمپ کے پہلے عہدِ صدارت میں امریکی عوام نے بڑے پیمانے پر احتجاجی مظاہرے کیے تھے، مگر اب وہ بہت تھکے ہوئے ہیں۔ جو لوگ ٹرمپ کے مخالف ہیں، وہ بہت حد تک اندرونی نوعیت کی نقل مکانی کا سہارا لے رہے ہیں۔ ری پبلک ٹاؤن ہال میٹنگز میں جب کوئی احتجاج کرتا ہے تو اُسے نجی ملیشیا حراست میں لے لیتی ہے۔

اسٹیفن رِکٹر دی گلوبلسٹ ڈاٹ کام کے پبلشر اور ایڈیٹر انچیف ہیں۔ وہ مصنفین اور تجزیہ کاروں کے عالمی نیٹ ورک گلوبل آئیڈیاز سینٹر کے ڈائریکٹر بھی ہیں۔ (مترجم: محمد ابراہیم خان)

"As Tesla goes down, so does Trump's United States?" ("The Globalist". March 11, 2025)

## بقیہ: شام: تشدد کی نئی لہر کے پیچھے کون؟

اسی لیے العودہ جیسے شخص کی اہمیت بڑھ جاتی ہے جو نہ صرف ایک معروف عسکری شخصیت ہیں بلکہ ان کے متحدہ عرب امارات کے ساتھ تعلقات بھی ہیں۔

بعض ماہرین کا خیال ہے کہ وہ شام کے خلیفہ حفتر بن سکتے ہیں یعنی وہ مضبوط فوجی لیڈر جسے متحدہ عرب امارات اور مصر کی حمایت حاصل ہے اور جس نے لیبیا میں اقوام متحدہ کی تسلیم شدہ حکومت کو چیلنج کیا ہوا ہے۔

تجزیہ کاروں کے مطابق اگر شام میں کوئی بغاوت شروع ہوتی ہے، تو ایران سمیت متحدہ عرب امارات اور مصری صدر عبدالفتاح السیسی اس کی مدد کریں گے، لیکن یہ اس پر منحصر ہے کہ نئی شامی انتظامیہ کتنی جلدی اور مؤثر طریقے سے استحکام قائم کرتی ہے۔

(بحوالہ: ''دی وائر اردو ڈاٹ کام''۔ ۱۲ مارچ ۲۰۲۵ء)

# طلبہ یونین کی بحالی کیوں ضروری

Omair Yusuf

تاریخی اعتبار سے طلبہ یونین فکری ارتقا، سیاسی تحرک اور معاشرتی اصلاح کے لیے ریڑھ کی ہڈی ثابت ہوتی رہی ہیں۔ طلبہ یونین انیسویں صدی کے یورپ میں بحث وتمحیص کی سوسائٹیز کی حیثیت سے نمودار ہوئی تھیں۔ اِن کا بنیادی مقصد نئی نسل کے ذہنوں میں جمہوری اقدار اور تخلیقی سوچ کے بیج بونا تھا۔ وقت گزرتا گیا اور یہ یونین معاشرتی تبدیلیوں اور بنیادی حقوق کے علم بردار پلیٹ فارمز کی حیثیت اختیار کرتی گئیں۔ جنوبی افریقا میں نسل پرستی پر مبنی امتیازی اور غاصبانہ نظامِ حکومت کے خاتمے میں دی نیشنل یونین آف ساؤتھ افریقن اسٹوڈنٹس نے اہم کردار ادا کیا۔ ۱۹۶۸ء میں پیرس میں بھی بہت بڑے پیمانے پر احتجاجی مظاہرے ہوئے۔ اِن مظاہروں کو کامیاب بنانے میں بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے طلبہ نے کلیدی کردار ادا کیا۔

پاکستان کے ابتدائی دنوں میں طلبہ یونین نے غیر معمولی مقبولیت اور کامیابی حاصل کی۔ یہ انجمنیں قیادت، سیاسی تحرک اور معاشرتی ارتقا کے لیے بہت اچھے پلیٹ فارم ثابت ہوئیں۔ اسلامی جمعیتِ طلبہ (جسے عام طور پر صرف جمعیت کہا جاتا ہے) اور نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن (این ایس ایف) جیسی طلبہ تنظیموں نے ایسی تحریکوں کی قیادت کی جن کے نتیجے میں قومی تاریخ میں اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ۱۹۸۴ء میں، جنرل ضیاالحق کے دورِ حکومت میں، طلبہ یونین پر پابندی عائد کردی گئی جس کے نتیجے میں جمہوریت کے لیے اٹھنے والی ایک اہم آواز خاموش ہوئی اور ایسا خلا پیدا ہوا جو تعلیمی اداروں اور معاشرے پر آج بھی محیط ہے۔ پاکستان کے ارتقا میں طلبہ یونین کے کردار کو سمجھنے کے لیے اُن کی جڑوں اور اثرات کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

پاکستان میں طلبہ یونین نے ملک کی سیاسی و معاشرتی ترقی، تعلیمی ماحول کے فروغ، جمہوریت کی بقا ونشو ونما، معاشرتی مقاصد اور قیادت کے ارتقا کے حوالے سے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ ۱۹۵۲ء میں بنگالی زبان کی تحریک سے ۱۹۶۸ء میں، این ایس ایف کی قیادت میں، جنرل ایوب خان کے خلاف احتجاجی مظاہروں تک طلبہ یونین نے نئی نسل کے سیاسی تحرک کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ اُن کا کردار قومی پالیسیوں کی تشکیل کے مرحلے پر بھی اثر انداز ہوتا تھا۔ ۱۹۷۲ء میں شملہ معاہدے سے متعلق مظاہروں اور ۱۹۷۴ء میں ختمِ نبوت تحریک کے مظاہرے اِس کا بیّن ثبوت ہیں۔ جن میں اسلامی جمعیتِ طلبہ نے کلیدی کردار ادا کیا۔ (ربوہ ریلوے اسٹیشن پر ۲۲ مئی ۱۹۷۴ء کو ہونے والے واقعات اس حوالے سے بہت اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔) سیاست سے ہٹ کر طلبہ یونین نے تعلیمی اداروں میں مباحثوں، ثقافتی پروگراموں اور کھیلوں کے مقابلوں کے ذریعے فکری ارتقا اور قائدانہ صلاحیت کو پروان چڑھانے میں ناقابلِ فراموش کردار ادا کیا ہے۔

۹ فروری، ۱۹۸۴ء کو جنرل ضیاء الحق کی سربراہی میں قائم حکومت نے طلبہ یونین پر ملک گیر پابندی عائد کی۔ اختلافِ رائے کے اظہار کی گنجائش ختم کرنے کے اِس اقدام کے وسیع البنیاد سنگین نتائج برآمد ہوئے۔ حکمران طبقے نے جمہوری انقلاب کا خطرہ بھانپتے ہوئے اُس کی راہ مسدود کرنے کی خاطر طلبہ تنظیموں اور اُن کے قائدین کے خلاف ملک گیر کریک ڈاؤن شروع کیا۔ اِس سے نسلی ولسانی بنیاد پر تشدد کی راہ ہموار ہوئی۔ بے لگام گروپوں نے فرقہ واریت کو بڑھاوا دیا، معاشرے میں ایسی تفریق وتقسیم شروع کی جس کا معاشرے کو پہلے کبھی کوئی تجربہ ہوا ہی نہیں تھا۔ تعلیمی اداروں میں طلبہ کو فراہم کی جانے والی سہولتوں کا نظام بُری طرح متاثر ہوا۔ جامعہ کراچی میں طلبہ کے لیے ۱۰۰ بسیں ہوا کرتی تھیں، آج ۳۰ رہ گئی ہیں۔ اِن میں سے بھی بہت سی ایسی ہیں جنہیں کباڑ خانے سے نکال کر کسی نہ کسی طور استعمال کے قابل بنایا گیا ہے۔ طلبہ یونین کا وجود مٹا دیے جانے سے طلبہ کے حقوق کے لیے آواز اٹھانے والا کوئی نہ رہا۔ ایک طرف تو طلبہ کو دی جانے والی سہولتوں میں غیر معمولی کمی واقع ہوئی اور دوسری طرف فیسیں بہت زیادہ بڑھا دی گئیں۔ تعلیمی اداروں میں انتخابات اور مباحث کے خاتمے سے جمہوری کلچر کا خاتمہ ہوگیا اور اِس کے منطقی نتیجے کے طور پر فکری ارتقا کی راہیں بھی مسدود ہوگئیں۔

طلبہ یونین پر عائد کی جانے والی پابندی پاکستان کے لیے صرف تعلیمی اعتبار سے نہیں بلکہ سیاسی اعتبار سے بھی بہت نقصان دہ، بلکہ تباہ کن ثابت ہوئی ہے۔ تازہ ترین مردم شماری کے مطابق پاکستان کی آبادی میں نوجوانوں کی تعداد نمایاں طور پر بہت زیادہ ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ آنے والے چند برسوں میں نوجوان ووٹرز ہی ملک میں سیاست کی سمت کا تعین کر رہے ہوں گے۔ طلبہ یونین کے نہ ہونے سے ملک میں نوجوانوں کو سیاسی اعتبار سے منظّم اور فعال رکھنے والا کوئی طریقہ نہیں۔ ملک کے مستقبل میں سب بڑا اسٹیک محنت کش اور متوسط طبقے کے نوجوانوں کا ہے اور المیہ یہ ہے کہ سیاست میں اُن کا کردار یقینی بنانے کی گنجائش بہت کم ہے۔ بنیادی جمہوریت کو سمجھے بغیر اور جمہوری عمل کا تجربہ نہ ہونے کی صورت میں سیاسی عمل بے معنی رہتا ہے اور اِس کے نتیجے میں مکالمے، سیاسی بحث وتمحیص اور سیاسی تحریکوں کے فروغ کی راہ ہموار ہونے کے بجائے سیاسی سطح پر افتراق وانتشار کو بڑھاوا ملتا ہے۔ ماضی میں محنت کش اور متوسط طبقے کے نوجوانوں کے لیے طلبہ یونین اہم ترین سیاسی پلیٹ فارم کا درجہ رکھتی تھیں، اس لیے اِسی پلیٹ فارم سے ملک کے مرکزی سیاسی دھارے کو بہت سے اعلیٰ سطح کے سیاسی قائدین ملے۔ ملک میں سیاسی جمہوریت کی انتہائی مایوس کن صورتحال کے پیشِ نظر طلبہ یونین کی بحالی وقت کی اہم ترین سیاسی ضرورت ہے۔ ملک میں نوجوان غالب اکثریت میں ہیں۔ اِن کی موثر رہنمائی کے لیے نوجوان قائدین کی اشد ضرورت ہے اور اس حوالے سے طلبہ تنظیمیں کلیدی کردار ادا کرسکتی ہیں۔

پابندی عائد کیے جانے سے قبل پاکستان میں طلبہ یونین نے نمایاں کامیابیاں حاصل کیں جن سے تعلیمی نظام اور معاشرے کی تشکیل وتطبیق میں اُن کے کلیدی کردار کی توضیح ہوتی ہے۔ ۱۹۶۲ء میں طلبہ تنظیموں کے شدید احتجاج پر جنرل ایوب خان کی حکومت نے تین سالہ ڈگری پروگرام واپس لیا۔ اِس سے پالیسیوں کی اصلاح کے حوالے سے طلبہ کے کردار کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ طلبہ یونین کی متواتر لابنگ کے نتیجے میں فیسیں معقول حد تک کم کی گئیں اور معاشرے کے ہر طبقے کے لیے تعلیم کی سہولت یقینی بنانے میں مدد ملی۔ اِس کے نتیجے میں اعلیٰ تعلیم سب کے لیے ممکن ہوسکی۔ تعلیمی میدان کے علاوہ اسلامی جمعیتِ طلبہ جیسی تنظیموں نے سماجی بہبود پر بھی توجہ دی۔ خون کے عطیات کی تحریک، بک بینکس، کتب میلوں اور اسٹوڈنٹس گالا جیسی سرگرمیوں کے نتیجے میں طلبہ کی تخلیقی صلاحیتوں کو شناخت کرنے اور پروان چڑھانے میں مدد ملی اور ساتھ ہی ساتھ ان پلیٹ فارمز سے ایسی تحریکیں بھی چلائی گئیں جن کے نتیجے میں طالبات کو ہراساں کیے جانے کے

واقعات کی روک تھام ہوئی۔

طلبہ یونین نے طلبہ کے لیے ٹرانسپورٹ کی سہولت یقینی بنانے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ جامعہ کراچی کی یونین طلبہ کے لیے بھرپور اور موثر ٹرانسپورٹ نیٹ ورک یقینی بنانے کے لیے سرگرداں رہتی تھی۔ احسن اقبال، لیاقت بلوچ، جاوید ہاشمی، قمر زمان اور دوسرے بہت سے نمایاں سیاسی قائدین طلبہ یونین کے پلیٹ فارمز سے اُبھرے اور ترقی کرتے کرتے مرکزی سیاسی دھارے میں شامل ہوئے۔ اِس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ طلبہ یونین سیاسی قیادت کو پروان چڑھانے والے پلیٹ فارمز کا درجہ رکھتی ہیں۔ جمہوریت اور ترقی کو یقینی بنانے کے لیے طلبہ یونینوں کا وجود بہت اہم تھا۔ نئی نسل کو سیاسی اعتبار سے مضبوط اور بااختیار بنانے، تعلیمی اداروں کے مجموعی کلچر کی بحالی اور زیادہ سے زیادہ قبولیت والے معاشرے کا احیا یقینی بنانے کے لیے طلبہ یونین کی بحالی ناگزیر ہے۔

طلبہ یونین پر پابندی عائد کرنے کا جواز یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اِن کی موجودگی سے تعلیمی اداروں میں تشدد پروان چڑھتا ہے اور اِس کے نتیجے میں تعلیمی عمل متاثر ہوتا ہے اور طلبہ کو بہتر زندگی کے لیے تیار ہونے میں مدد نہیں ملتی۔

پابندی عائد کیے جانے سے قبل پاکستان میں طلبہ سیاست غیر معمولی سطح پر متحرک تھی۔ اس کے نتیجے میں تعلیمی اداروں میں مرکزی اسٹیک ہولڈرز کو اپنے حقوق اور سہولتوں کے لیے بہتر طور پر آواز اٹھانے اور اپنی بات منوانے کا بھرپور موقع ملتا تھا۔ تب تعلیمی اداروں میں طلبہ انتخابی اور انتخابات کی شکل میں جمہوری عمل میں بھرپور طریقے سے شریک ہوتے تھے۔ طلبہ تنظیموں کے نہ ہونے سے تعلیمی اداروں میں احتساب کا نظام مفقود ہے۔ جامعات اب اپنی مرضی کے مطابق فیسیں مقرر کرتی ہیں اور کوئی احتجاج کرنے والا نہیں۔ تعلیمی وظائف کو پوری دیانتداری اور غیر جانبداری سے تقسیم کرنے کا نظام بھی موجود نہیں۔ اِس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ طلبہ اور اُن کے والدین اب جامعات کی سطح پر تعلیم کے حصول کے حوالے سے زیادہ سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کر رہے۔

حکومت اور جامعات دونوں کو یہ اندازہ ہونا چاہیے کہ تعلیمی اداروں میں طلبہ یونین کی راہ مسدود کرنا آئین کے آرٹیکل ۱۷ کی صریح خلاف ورزی ہے جو تمام شہریوں کو تنظیم سازی کا حق دیتا ہے۔ واحد شرط یہ ہے کہ ایسی تنظیموں کو ملک کی خودمختاری، نظمِ عامہ اور اخلاقیاتِ پاکستان کے خلاف نہیں ہونا چاہیے۔ حکومتِ پاکستان کے پاس ایسی کوئی حقیقی بنیاد نہیں جس کی روشنی میں یہ دعویٰ کیا جاسکے کہ اِس معیار کا اطلاق طلبہ یونین پر بھی ہوتا ہے۔ طلبہ تنظیموں کے خلاف واحد جواز یا دلیل یہ ہے کہ یہ تشدد کی راہ ہموار کرتی ہیں۔ یہ جواز یا دلیل مکمل طور پر بے بنیاد ہے اور ملک میں جمہوریت، حقوق کی پاسبانی اور طلبہ کی بہبود سے متعلق اُن کے کردار کو مکمل طور پر نظر انداز کرتی ہے۔

عالمی سطح پر طلبہ یونینیں بہت اہمیت کی حامل ہیں کیونکہ یہ ترقی اور خوش حال کے کاز کے لیے کام کرتی ہیں اور سیاست میں طلبہ کی نمائندگی اور کردار کی راہ ہموار کرتی ہیں۔ برطانیہ میں دی نیشنل یونین آف اسٹوڈنٹس ۶۰۰ اداروں میں معقول فیس والی تعلیم اور قابلِ رشک ذہنی صحت کے حق میں کردار ادا کرتی ہے۔ بھارت میں جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کی طلبہ یونین سیاسی تحرک کو بہبودِ طلبہ سے جوڑتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ قومی سطح کے مباحث اور بیانیوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ امریکا میں اسٹینفرڈ یونیورسٹی جیسے معیاری تعلیمی ادارے طلبہ یونینوں کو ادارے کے انتظامی ڈھانچے کا حصہ بناتے ہیں اور اس بات کو بھی یقینی بناتے ہیں کہ اداروں کے بنیادی فیصلوں میں طلبہ کی بھرپور نمائندگی ہو۔ یہ مثالیں ثابت کرتی ہیں کہ اگر ڈھانچا درست ہو اور احتساب کا عمل موثر ہو تو طلبہ تنظیمیں تعلیمی اداروں کی کارکردگی بہتر بنانے اور عملی سیاست کے حوالے سے نئی نسل کو تیار کرنے میں غیر معمولی کردار ادا کرسکتی ہیں۔

پاکستان میں پائے جانے والے سیاسی چیلنجوں سے نپٹنے کے لیے طلبہ یونینوں کی فوری بحالی ناگزیر ہے۔ سیاسی سطح پر قائدانہ صلاحیت، نئے قائدین کی تیاری اور جمہوری اقدار کے فروغ کے لیے طلبہ یونینیں لازم ہیں۔ طلبہ تنظیمیں طلبہ کے حقوق، بڑھتی ہوئی فیسوں جیسے مسائل، ناکافی سہولتوں اور ہراساں کیے جانے کے واقعات کے خلاف بھرپور کردار ادا کرسکتی ہیں۔ اتحاد و یگانگت اور تعمیری مکالمے کو پروان چڑھا کر طلبہ یونینیں سیاسی سطح پر افتراق و انتشار اور محاذ آرائی کو کم کرنے کے ساتھ ساتھ سب کو ساتھ لے کر چلنے کا ماحول پیدا کرنے میں بھی کلیدی کردار ادا کرسکتی ہیں۔ طلبہ یونین طلبہ اور انتظامیہ کے درمیان پائی جانے والی خلیج کو پاٹ کر تعلیمی اداروں کے مجموعی ماحول کو توانا رکھتی ہیں اور علمی و فکری ارتقا یقینی بناتی ہیں۔

طلبہ یونینوں کی بحالی کے لیے احتساب یقینی بنانے اور تنازعات کی روک تھام سے متعلق قانونی ڈھانچے، جامعات کی پالیسی سازی میں طلبہ کی شمولیت اور مستقبل کے قائدین کی تیاری ممکن بنانے والے پروگرام لازم ہیں۔ ۱۹۸۴ء میں طلبہ یونینوں پر پابندی عائد کیے جانے سے طلبہ کی آواز خاموش کردی گئی اور جمہوری کلچر کا خاتمہ ہوگیا۔ طلبہ یونینوں کی بحالی محض ماضی کی ایک یاد کو بحال کرنے کا معاملہ نہیں بلکہ یہ ایک ترقی پسند اور سب کو ساتھ لے کر چلنے والا معاشرہ یقینی بنانے کی طرف اٹھایا جانے والا اہم قدم ہے۔ طلبہ یونینوں کے ذریعے نئی نسل کو اختیارات سے نواز کر پاکستان ایک ایسی نسل تیار کرسکتا ہے جو بصیرت، یگانگت اور بھرپور عزم کے ساتھ ترقی کی طرف لے جاسکے۔ آگے بڑھنے کی راہ یہ ہے۔

عمیر یوسف قانون کے طالبِ علم، نوجوانوں کے حقوق کے علم بردار اور طالب علم رہنما ہیں۔

(مترجم: محمد ابراہیم خان)

"Reviving student unions".

("The Nation". March 5, 2025)


## اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کی مطبوعات... ہر گھر، ہر خاندان کے لیے!

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| قُرآن کا نظامِ خاندان | 40/= | اِصلاحِ معاشرہ | 600/- | زندگی کے عام فقہی مسائل (جلد اوّل تا پنجم) | 2500/- |
| مسلمان عورت کے حُقوق | 200/= | اسلام کا عائلی نظام | 250/= | خانگی زندگی اور اُسوۂ حَسَنہ | 100/= |
| عورت اور اسلام | 150/= | تحریکِ حقوقِ نسواں | 300/= | خاندان کو لاحق خطرات اور مُمکنہ لائحہ عمل | 60/= |
| مسلمان خواتین کی ذمہ داریاں | 100/= | بچّوں کے ذہنی اَمراض | 400/= | گھریلو تشدّد اور اسلام | 60/= |
| بچّے اور اسلام | 40/= | بچّوں میں خَوف | 150/= | آزاد بچّے، آزاد والدین | 500/- |

اکیڈمی بک سینٹر۔ ڈی ۳۵، بلاک ۔۵، فیڈرل بی ایریا، کراچی فون: ۳۶۳۶۸۰۲۰

# بڑھتا دباؤ، ایران دَوراہے پر!

ڈاکٹر ماجد رفیع زادہ

اس نوعیت کی انٹیلی جنس رپورٹس میں اضافہ ہو رہا کہ اسرائیل آنے والے مہینوں میں کسی وقت بھی ایران کے جوہری پروگرام پر حملہ کرسکتا ہے۔ وزیراعظم نیتن یاہو کی زیر قیادت اسرائیلی حکومت ایک طویل عرصے سے ایران کے جوہری پروگرام اور ایران کے جوہری ارادوں کو اسرائیل کے لیے خطرے کے طور پر دیکھتی ہے۔ ایران دھیرے دھیرے اپنے ہاں یورینیم کی افزودگی میں خاموشی کے ساتھ مسلسل اضافہ کر رہا ہے۔ جیسا کہ بین الاقوامی جوہری واچ ڈاگ کی تازہ رپورٹ میں بھی بتایا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ایران اپنے بیلسٹک میزائل صلاحیت کو بھی بڑھاتا جا رہا ہے۔

اسرائیل ایران کی جوہری تیاری کے اس مرحلے کو ایک اہم موقع کے طور پر دیکھتا ہے کہ اگر اب ایران پر پیشگی حملہ کر کے اس کی ممکنہ جوہری اہلیت کی تیاری برباد نہ کی گئی تو پھر ایران کو جوہری ہتھیار بنانے سے روکنا غیر ممکن ہو جائے گا اور ایران ''پوائنٹ آف نو ریٹرن'' پر پہنچ چکا ہوگا۔ گویا اسرائیل اسے اپنے لیے ''ابھی ورنہ کبھی نہیں'' والی صورتحال کے طور پر سمجھ رہا ہے۔

ایران پر یہ ممکنہ اسرائیلی حملہ اسرائیل کا کسی تنہائی میں کیا گیا حملہ نہیں ہوگا۔ بلکہ ایک وسیع البنیاد کوشش کے حصے کے طور پر ہوگا کہ اسرائیل جو کچھ خطرات دیکھ رہا ہے انہیں مل کر نیوٹرائلز کر دیا جائے۔ اس سے پہلے کہ ایران جوہری ہتھیار تیار کر چکا ہو۔

تل ابیب میں بیٹھے حکمت کار اندازہ لگا رہے ہیں کہ اس سے پہلے کہ ایران جوہری ہتھیار بنانے کی صلاحیت حاصل کر لے ایران پر حملہ کر دیا جائے۔ بصورت دیگر ایران اس طرح کے کسی بھی حملے کو روکنے کی جوہری اہلیت پیدا کر لے گا۔

اس پس منظر میں اسرائیلی وزیراعظم نیتن یاہو نے ایک موثر سکیورٹی ڈاکٹرائن پیش کر رکھی ہے اور ایران کے خلاف ایک جارحانہ دباؤ میں اقدامات کا اضافہ بھی سوچا گیا ہے۔

اسرائیلی حکام کا بالعموم یہی کہنا ہے کہ ایران پر فوجی حملے کو جس قدر التوا میں رکھا جائے گا، اس کا مطلب صرف یہ ہوگا کہ ایران کو حالات زیادہ سنگین کرنے اور صورتحال زیادہ خطرناک بنانے کا موقع دیا جائے۔ ایران پر ایک مکمل اور بھرپور حملہ ایرانی حکومت کے خود ایران میں جواز کو مسخ کرے گا اور بین الاقوامی سطح پر اس کی حیثیت پر بھی اثر پڑے گا۔

اسلامی جمہوریہ ایران نے اپنے جوہری پروگرام پر بھاری سرمایہ کاری محض توانائی کی ضروریات کے لیے یا اپنے ڈیٹرنس کے لیے نہیں کی ہے۔ بلکہ اس کی سرمایہ کاری اس کے قومی جوہری تفاخر و قوت کی بھی ضرورت ہے۔ کہ ایران نے تمام تر پابندیوں اور رکاوٹوں کے باوجود ہتھیاروں اور ٹیکنالوجی کے شعبے میں اتنی بڑی کامیابی حاصل کر کے دکھادی ہے۔

ایرانی سپریم لیڈر خامنہ ای اور پاسداران انقلاب نے ایک عرصے سے اپنے جوہری پروگرام میں مسلسل ہوتی پیش رفت کو مغربی و امریکی پابندیوں کے باوجود اپنی غیر معمولی اور ناقابل شکست صلاحیتوں کے کھاتے میں پیش کیا ہے۔

اگر اسرائیل کامیابی سے ایرانی جوہری پروگرام کو تباہ کر لیتا ہے تو یہ ایران کے لیے نفسیاتی اور سیاسی اعتبار سے ایک غیر معمولی دھچکا ہوگا۔ یہ دھچکا ایرانی حکومت کے لیے بھی بہت برا ہوگا۔ یہ ایرانی کمزوری کا بھی ایک واضح اظہار ہوگا اور یہ بھی ظاہر کرے گا کہ ایران علاقے میں اپنے دشمن کے مقابلے میں فوجی اعتبار سے ایسا مضبوط نہیں ہے کہ حملے کو روک یا ناکام بنا سکے۔

خصوصاً ایسے ماحول میں جب ایران سالہا سال سے اپنی فوجی صلاحیتوں کو بڑھانے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ اس میں ایران نے اپنے فضائی دفاعی نظام کو جدید تر بنانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ اسرائیل یہ ثابت کر سکے گا کہ ایران کا دفاعی میزائل سسٹم بھی قابل بھروسہ نہیں ہے۔

ایران پر ممکنہ نئے اسرائیلی حملے کا وقت ان معنوں میں برا نہیں ہو سکتا ہے۔ پچھلے سال کے دوران جب اسرائیل نے ایران پر حملے کیے تو ایران کو شدید جغرافیائی سیاسی دھچکے کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اسرائیلی حملے کے نتیجے میں ایران کا علاقائی اثر و رسوخ مجروح ہوا ہے۔ اس کی سب سے اہم مثال شام کی ہے جہاں سے بشارالاسد کے اقتدار کے خاتمے نے ایران کو مزید کمزور اور تنہا کر دیا ہے۔

شام کی بشار رجیم پر ایران ایک دہائی سے زیادہ عرصے میں اربوں ڈالر کا سرمایہ لگا چکا تھا۔ سالہا سال سے یہ ایران کی اہم اتحادی حکومت تھی۔ اسد حکومت لبنان کی حزب اللہ تک اسلحے کی رسائی اور سرمائے کی فراہمی کے لیے بھی ایران کی اہم سہولت کار تھی۔ مگر اسد حکومت کے خاتمے نے ایران کی اپنی اتحادی ملیشیاؤں کے ساتھ سپلائی اور ہم آہنگی کی صلاحیت کو بھی بری طرح متاثر کر دیا۔

ایران کے لیے خطے میں ایک بڑا اسٹریٹجک خلا پیدا ہو گیا ہے جس کا ازالہ اب مشکل تر ہے۔ بشار حکومت کے خاتمے سے یمن کے حوثیوں کے لیے بھی ایرانی امداد اور اسلحے کی ترسیل رک گئی ہے۔ گویا ایک اور ایرانی اتحادی ایران کے لیے ماضی کی طرح اب کارآمد نہ رہ سکے گا۔ یوں ایران کا خطے میں منظم کردہ 'پراکسی نیٹ ورک' جو ایرانی خارجہ پالیسی کا اہم ستون ہے، ہر جگہ سے بڑھتے ہوئے دباؤ کی زد میں آچکا ہے۔

یہ بھی اسرائیل کی ایک بڑی کامیابی ہے کہ اس نے لبنان میں حزب اللہ، عراق میں شیعہ ملیشیا اور یمن میں حوثیوں سمیت ایرانی حمایت یافتہ گروپوں کے خلاف اپنی جنگی کارروائیوں کو مزید بڑھا دیا ہے۔ اس کے نتیجے میں ایران کی پراکسیز نقصان سے دوچار ہو گئی ہیں۔ بلاشبہ ان کی ایران کے تذویراتی دفاع کے طور پر کام کرنے کی صلاحیت کمزور ہو چکی ہے۔

ایران کے لیے ان بار بار کے دھچکوں کے امتزاج نے ایران کو ماضی کے مقابلے میں انتہائی زیادہ نقصان سے دوچار کر دیا ہے۔ یہ حالات ایران کے لیے کہیں زیادہ خطرناک ہیں۔

ادھر امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ ایران کے خلاف زیادہ سے زیادہ دباؤ کی پالیسی کے ساتھ متحرک ہیں۔ گویا وہ نئے سرے سے ایرانی چیلنجوں کو بڑھا رہے ہیں۔ وائٹ ہاؤس میں واپسی کے بعد ٹرمپ نے ایران کے خلاف اقتصادی پابندیوں کو بھی سو فیصد بڑھا دیا ہے۔

اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ صدر ٹرمپ نے ایران کے خلاف اسرائیل کے ممکنہ فوجی اقدامات کی بھرپور حمایت کا بھی اشارہ دے دیا ہے۔ سابقہ جو بائیڈن انتظامیہ وسیع تر علاقائی استحکام کے علاوہ اسرائیلی سلامتی کے حق میں توازن پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ اس لیے نئی امریکی انتظامیہ زیادہ جارحانہ انداز میں اسرائیلی مؤقف کی حمایت کے لیے مائل ہے۔

اس کا مطلب واضح طور پر یہ ہے کہ ایران کی جوہری تنصیبات پر اسرائیل کے کسی بھی وقت حملے کو واشنگٹن کی طرف سے مکمل سیاسی، سفارتی اور ممکنہ لاجسٹک مدد میسر ہوگی۔

ایرانی قیادت ممکنہ طور پر دباؤ کو کم کرنے کے لیے کچھ ٹیکٹیکل نوعیت کی تبدیلیاں ظاہر کر سکتی ہے۔ جس میں اپنے آپ کو مذاکرات کی طرف مائل دکھانا اور امریکا کے ساتھ جوہری معاہدے کی تجدید کرنے کی خواہش کا اظہار بھی شامل ہو سکتا ہے۔

تہران کی تاریخی طور پر یہ پریکٹس رہی ہے کہ جب بھی اسے سفارتی دباؤ کا زیادہ سامنا ہوا تو اس نے اپنے آپ کو

مذاکرات میں مصروف کرنے کی کوشش کی اور وقت حاصل کرلیا۔ یوں ایران نے مذاکراتی عمل کا حصہ بننے کو وقت حاصل کرنے کے ایک حربے کے طور پر استعمال کیا اور فوری خطرات سے نکلنے کی کوشش کی۔

اگر اسرائیلی خطرات فوری شکل میں ظاہر ہوتے ہیں تو ایران ہوسکتا ہے کہ ایسی آمادگی کے اشارے دے کہ وہ بالواسطہ طور پر بات چیت کے لیے تیار ہے۔ تاہم اس کے باوجود اس طرح کی ممکنہ ''ڈپلومیٹکل منورینگ'' ایران کی بنیادی پالیسیوں میں تبدیلی کا باعث ہوں گی نہ کہ خارجہ پالیسی کی تبدیلی کا ذریعہ۔

اسلامی جمہوریہ ایران قطعاً ایک ایسی ریاست نہیں ہے جو روایتی طور پر عملیت پسندی پر مبنی فیصلے کرے اور جو اس کے فوری تزویراتی تجزیے پر مبنی ہو بلکہ وہ ایک نظریاتی و انقلابی حکومت ہے۔ جس کی نظریاتی بنیاد بڑی سختی کی حامل ہے اور اس نظریاتی ساخت کے فریم ورک سے ۱۹۷۹ء سے اب تک نکلنا ممکن نہیں ہوا۔ ایرانی حکومت تب سے ایک باقاعدہ مغرب مخالف اور اسرائیل دشمن حکومت ہے۔ جس نے مزاحمتی اتحادیوں کے ذریعے امریکا و مشرق وسطیٰ پر اثر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے وہ اپنے اس طریقہ کار سے بدلنے کی کوشش نہیں کرے گا۔

اگر ایران کشیدگی میں کسی عارضی کمی کے لیے تزویراتی مفاہمت اور تحمل کا مظاہرہ کرتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ اس نے حقیقی معنوں میں اپنے آپ کو بدل لیا یا وہ تبدیلی چاہتا ہے۔

ایران کی حکومت نے بارہا اس امر کا اظہار کیا ہے کہ اس کی نظریاتی کمٹمنٹ اس کی عارضی بقا اور مفادات سے بلند تر ہے۔ تاہم معاشی مشکلات اور فوجی دھچکے ایران کو کچھ ٹیکٹیکل نوعیت کی تبدیلیوں کی طرف ضرور دھکیل سکتے ہیں۔ یہ اس کے طویل مدتی سفارتی مقاصد سے انحراف نہیں ہوگا نہ ہی اس کی اسرائیل سے دشمنی سے ہٹنے کی بات ہوگی اور نہ ہی اپنی مسلح پراکسیز کی حمایت سے پیچھے ہٹنے یا امریکا کے خلاف اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کی کوشش سے رکے گا۔

اسرائیل کے ایرانی جوہری پروگرام پر ممکنہ حملے اور امریکی اقتصادی پابندیوں کے ساتھ فوجی دباؤ سے تہران میں کچھ منظر بدلا تو یہ ایرانی خارجہ پالیسی میں کلیدی تبدیلی نہیں ہوگی، نہ ہی ایران اپنے نظریاتی اصولوں سے دستبردار ہوگا۔

(بحوالہ: ''العربیہ اردو ڈاٹ نیٹ''۔ یکم مارچ ۲۰۲۵ء)

# جنوبی افریقا کی مَعاشی مشکلات

اِس میں کوئی شک نہیں کہ محلِ وقوع کے لحاظ سے جنوبی افریقا کو افریقا کے دوسرے بہت سے ممالک پر غیر معمولی فوقیت حاصل ہے اور وہ ایک ابھرتی ہوئی معیشت ہے مگر اِس کے باوجود اُسے بہت سے معاشی چیلنجز کا سامنا ہے۔ کرپشن بہت زیادہ ہے جس کے باعث قومی ترقی کے اہداف پورے نہیں ہو پاتے اور ملک پر قرضوں کا بوجھ بہت زیادہ ہو چکا ہے۔

جنوبی افریقا میں جی ڈی پی اور مجموعی سرکاری قرضوں کے درمیان تناسب (۲۰۰۸ء سے) ۲۴ سے ۷۵ فیصد تک جا پہنچا ہے۔ اِس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جنوبی افریقا کی حکومت کے لیے اب معاشی امور کو ڈھنگ سے چلانا کتنا دشوار ہو چکا ہے۔ اس وقت حکومت مجموعی سالانہ آمدنی کا کم و بیش ۲۰ فیصد قرضوں کے سُود کی مد میں ادا کر رہی ہے۔ صحتِ عامہ اور پولیس سروس پر خرچ کی جانے والی رقم بھی کم و بیش اِتنی ہی ہے۔ اِس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حکومت بہبودِ عامہ کے منصوبوں کے لیے کس طور رقم نکال پاتی ہوگی۔

جنوبی افریقا کی معاشی نمو کی رفتار خاصی کم ہے۔ جی ڈی پی کی افزائش کی سالانہ شرح ۳ء۱ رہے جبکہ ملک کی آبادی (سوا ۶ کروڑ) میں اضافے کی رفتار ۴ء۱ رہے۔ حکومت اس فرق کو کم کرنے میں کسی طور کامیاب نہیں ہو پا رہی۔ قومی وسائل کے تناسب سے آبادی زیادہ ہے۔

افریقن نیشنل کانگریس کی حکومت ایک طرف تو سرکاری اخراجات کم کرنے میں کامیاب نہیں ہو پائی اور دوسری طرف وہ سرکاری اداروں کے لیے بیل آؤٹ پیکیجز لانے کی روایت پر کاربند رہی ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ کرپشن کا ہے۔ سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں مہنگائی میں اضافے کے تناسب سے کہیں زیادہ اضافہ عام بات ہے۔ یہ سارا بوجھ گھوم پھر کر عوام ہی کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ حکومت اپنے اخراجات پر قابو پانے والے اقدامات سے اب تک اجتناب ہی برتتی آئی ہے۔

سرکاری ملکیت والے اداروں کی کارکردگی بہتر بنانے کے بجائے اُن کے لیے بیل آؤٹ پیکیجز لانے سے قومی بجٹ پر غیر ضروری دباؤ مرتب ہوتا رہا ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ اُنہیں یا تو سخت تر انتظامی اقدامات کے ذریعے درست کیا جائے یا پھر بیچ ہی دیا جائے۔

سونا، پلاٹینم اور کرومیم کی پیداوار میں جنوبی افریقا کا پہلا نمبر ہے۔ اِن اہم برآمدات کا جی ڈی پی میں غیر معمولی حصہ ہے۔ دوسری بہت سی برآمدات بھی معیشت کو توانا رکھنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ لیکن یہاں ریلوے کا نظام درست نہیں اور بندرگاہوں کی کارکردگی بھی اِتنی اچھی نہیں کہ برآمدات کے فروغ میں کوئی کلیدی کردار ادا کرسکے۔ مواصلات کا بنیادی ڈھانچا محض اپ ڈیٹ نہیں بلکہ اپ گریڈ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس طرح حکومت اندرونِ ملک معاشی سرگرمیوں کو غیر معمولی تحرک فراہم کرکے اور برآمدات میں اضافے سے اپنی معیشت کو غیر معمولی حد تک تقویت سے ہمکنار کرسکتی ہے۔

جنوبی افریقا کا ایک بنیادی مسئلہ معاشی اور معاشرتی ناہمواری ہے۔ ملک بھر میں شدید افلاس پایا جاتا ہے۔ غربت کی لکیر سے نیچے جینے والوں کی تعداد بھی کم نہیں۔ عشروں کی نسل پرستی نے جو مسائل پیدا کیے، اُن کی جڑیں اب تک گہری اور مضبوط ہیں۔ معاشرتی اور معاشی تفریق نے ملک کو بُری طرح جکڑ رکھا ہے۔ طبقاتی فرق بہت زیادہ ہے۔ ایک طرف انتہائی مالدار لوگ ہیں اور دوسری طرف انتہائی مفلس۔ یہی سبب ہے کہ ملک میں جرائم کا گراف بھی نیچے نہیں آپاتا۔

جرائم پیشہ گروہوں نے جنوبی افریقا کو اپنے گڑھ میں تبدیل کر رکھا ہے۔ بہت سے ملکوں کے بڑے گینگز جنوبی افریقا سے آپریٹ کرتے ہیں۔ ملک کی ساکھ اس حوالے سے پریشان کن ہے اور بیرونی سرمایہ کار یہاں سرمایہ لگانے سے گریزاں ہی رہتے ہیں۔ کالے دھن کو سفید کرنے کا دھندا بھی جنوبی افریقا سے کیا جاتا ہے۔ عالمی سطح پر یہ شناخت بہت خطرناک اور نقصان دہ ہے۔

جنوبی افریقا کا محلِ وقوع اُسے بھرپور ترقی اور خوشحالی کا اہل بناتا ہے مگر سرکاری مشینری کی نااہلی اور کرپشن کے باعث ایسا نہیں ہو پا رہا۔ رہی سہی کسر جرائم کے حوالے سے گندی شناخت نے پوری کردی ہے۔ نظم و نسق کی بہتری، کرپشن کی روک تھام اور جرائم پیشہ گروہوں کی بیخ کُنی کے بغیر جنوبی افریقا اپنی پسماندگی دور نہیں کرسکتا۔ اس حوالے سے فوری اور انقلابی نوعیت کے اقدامات ناگزیر ہیں۔ حکومت کو بھرپور سیاسی و معاشی عزم کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ (مترجم: محمد ابراہیم خان)

"South Africa's economic challenges".
("The Globalist". March 18, 2025)

# شام: تشدّد کی نئی لہر کے پیچھے کون؟

افتخار گیلانی

بشارالاسد کی آمرانہ حکومت کے خاتمے کے بعد ایسا لگتا تھا کہ پچھلی ایک دہائی سے زائد عرصہ سے خانہ جنگی کے شکار ملک شام میں اب عوام راحت کا سانس لیں گے کہ ساحلی علاقوں میں تشدد کے واقعات میں ایک ہزار سے زائد افراد ہلاک ہو گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ کئی نادیدہ قوتوں کو شام کا امن وامان اور استحکام راس نہیں آ رہا ہے۔

برطانیہ میں قائم وار مانیٹرنگ گروپ کے مطابق نئی شامی حکومت کی افواج کے تقریباً ۱۲۵ اہلکار بھی ہلاک ہو گئے ہیں۔ عبوری صدر احمد الشراع نے قومی وحدت اور داخلی امن کو محفوظ رکھنے کی اپیل کی ہے۔

لطاکیا کے علاوہ تشدد اللاذقیہ اور طرطوس کے صوبوں میں پھوٹ پڑا، جو شام کے بحیرہ روم کے ساحل پر واقع ہیں اور ملک کی علوی اقلیت کا مرکز سمجھے جاتے ہیں۔

مقامی صحافیوں کے مطابق پچھلے ہفتے جب اسد نواز ملیشیا نے ساحلی شہر جبیلہ اور اس کے گرد و نواح میں سکیورٹی گشت پر حملہ کیا تو اس کے جواب میں شام کے نئے حکمرانوں سے وابستہ فورسز کو تعینات کیا گیا، جس کے بعد علوی برادری کے خلاف انتقامی قتل عام کی خبریں سامنے آئیں۔ جھڑپوں کا مرکز اللاذقیہ اور تارتوس تھے، جو شام کی علوی برادری کا گڑھ سمجھے جاتے ہیں، اور جو اسد کے بڑے حامی رہے ہیں۔

اس سے ملحق صوبہ درعا فرقہ کا مسکن ہے، جن کی پشت پناہی اسرائیل کرتا ہے۔ علوی فرقہ پورے شام کی آبادی کا دس سے پندرہ فیصد ہے، مگر اسد حکومت کے دوران چونکہ ان کو مراعات حاصل تھیں اس لیے وہ خاصے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اونچے عہدوں پر براجمان تھے۔ گو کہ احمد الشراع نے عام معافی کا اعلان تو کر دیا تھا، مگر اکثریتی سنی آبادی کے ایک بڑے طبقہ میں علوی فرقہ کے خلاف لاوا پک رہا تھا۔ اسد دور کے فوجی عہدیدار، جو انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیوں کے مرتکب ہوئے ہیں، نے لطاکیا میں پناہ لی ہوئی تھی۔ شامی عوام کا ایک بڑا طبقہ ان کو احتساب کے دائرے میں لانے پر دباؤ ڈال رہا تھا۔

علوی اکثریتی علاقے میں حالیہ مہینوں میں وقفے وقفے سے تشدد کی خبریں آ رہی تھیں تاحال ایسا کوئی مرکزی گروہ سامنے نہیں آیا جو ان حملوں کی قیادت کا دعویٰ کرتا ہو۔ لیکن پچھلے ہفتے جو حملے سیکورٹی فورسز پر کیے گئے، تو ایک گروہ جس نے اپنا نام 'ملٹری کونسل فار دی لبریشن آف سیریا' بتایا، نے اس کی ذمہ داری قبول کی۔ اس بیان پر ایک سابق جنرل غیث دالہ کے دستخط تھے۔ وہ اسد حکومت میں فوج کی ایلیٹ چوتھی ڈویژن کے ایک کمانڈر تھے۔

مڈل ایسٹ کو کور کرنے والے صحافیوں کے پاس حالیہ عرصے میں کئی گروہوں کی ویڈیو آ رہی تھیں، جن میں مسلح افراد شام کی نئی قیادت کے خاتمے کا مطالبہ کر رہے تھے اور حملوں کی ذمہ داری قبول کر رہے تھے۔ تاہم آزادانہ طور پر ان کی تصدیق نہیں ہو رہی تھی۔ شام کی انٹیلی جنس سروسز کے نئے سربراہ، انس خطیب کے مطابق حالیہ تشدد کے پیچھے سابق اسد حکومت کے فوجی رہنما ہیں، جو مفرور ہیں اور احتساب سے بچنا چاہتے ہیں۔

شام کی وزارت دفاع کے ترجمان کرنل حسن عبدالغنی نے بتایا کہ ہزاروں عسکریت پسندوں نے اپنے ہتھیار ڈال دیے ہیں اور اللاذقیہ کے علاقے المختاریہ، المزیرعہ، الزوبار اور دیگر مقامات کے علاوہ، تارتوس میں الدالیہ، طانطہ اور قداموس کے قصبوں میں کارروائیاں مکمل کر لی گئی ہیں۔ ان جھڑپوں کے بعد شام کے دیگر علاقوں میں جوابی احتجاجی مظاہرے بھی ہوئے ہیں، جو حکومت کے سابق عہدیداروں کو سزا دینے اور عام معافی کو واپس لینے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

سینئر ترک صحافی اور تجزیہ کار ہمت اوزترک کا کہنا ہے کہ لطاکیا میں علوی فرقہ کی بغاوت یا مزاحمت متوقع تھی، مگر شامی حکومت کا اس سے نپٹنے کا طریقہ درست نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ شامی حکومت نے پولیس کو بحال و مضبوط کرنے کے بجائے شہری سیکورٹی جنگجوؤں کے حوالے کی ہے، جو کسی بھی نقطہ نظر سے صحیح نہیں ہے۔

اوزترک جو ابھی شام کا ایک ماہ کا دورہ کر کے واپس انقرہ لوٹے ہیں کا کہنا ہے کہ سیکورٹی کی ذمہ داری ان افراد کے سپرد کی گئی، جو سابق حکومت کے خلاف انتقام کی آگ میں جل رہے ہیں۔

بیشتر عرب ممالک اور ترکیہ شام میں ایک مضبوط مرکز کے خواہاں ہیں۔ جبکہ اسرائیل اور پورپی ممالک بشمول امریکا ایک وفاقی نظام کی وکالت کرتے ہیں، جس کے تحت شمال مشرقی شام میں کردوں کو داخلی خودمختاری دی جائے۔ کردوں کے پاس شام کا تیس فیصد علاقہ ہے، جبکہ وہ شام کی آبادی کا صرف دس فیصد ہیں۔ اسی طرح مغربی ممالک ساحلی علاقہ لطاکیہ وغیرہ علوی فرقہ کو اور اسرائیلی سرحد سے ملحق علاقے دروز فرقے کے سپرد کرنا چاہتے ہیں۔ ان دونوں علاقوں کو اندرونی خودمختاری دینے پر دباؤ ڈال رہے ہیں۔ یہ طاقتیں ایک مضبوط دمشق کو اسرائیل کے لیے خطرہ قرار دیتی ہیں۔

ساحلی خطے میں جس بڑے پیمانے پر بغاوت ہوئی، اس سے لگتا ہے کہ سابق حکومت کے عہدیداروں کے پاس اسلحے کی کمی نہیں ہے۔ گو کہ شہری علاقوں میں اس بغاوت کو سختی کے ساتھ کچل دیا گیا ہے، مگر پہاڑی علاقوں میں وہ سرگرمیاں جاری رکھ سکتے ہیں۔ اوزترک کے مطابق ایسا لگتا ہے کہ ان علاقوں میں ایرانی حمایت یافتہ شیعہ ملیشیا بھی موجود ہیں، ایران انہیں مدد فراہم کر رہا ہے، تاکہ شام میں اس کا کردار اور اثر و رسوخ برقرار رہے۔

اب جب کہ بشارالاسد کی حکومت کا خاتمہ ہو چکا ہے، تجزیہ کار جنوبی شام کے درعا کے احمد العودہ کو ایک ممکنہ خطرہ کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔

العودہ، ایک وقت میں اسد کے خلاف بغاوت کا حصہ تھے۔ بعد میں روس کے ساتھ معاہدے کے ذریعے اسد حکومت کے ساتھ 'مفاہمت' کر کے ان کی فورسز کو شامی فوج کے روسی حمایت یافتہ پانچویں کور میں ضم کر دیا گیا تھا۔

جب حیات التحریر الشام کی قیادت میں اپوزیشن گروپوں نے دمشق کی طرف پیش قدمی کی، تو العودہ اور ان کے جنگجوؤں نے جنوب سے دمشق کی طرف پیش قدمی کی تھی۔ مگر الشراع کے پہنچنے سے قبل ہی انہوں نے دمشق کو خالی کر دیا تھا۔ روس کے زیر اثر اسد حکومت نے جنوبی شام میں ان کو خودمختاری دی ہوئی تھی۔ وہ بھی اس خودمختاری کو سرنڈر کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

مزید یہ کہ اگر شام کے نئے حکمران ملک کو مؤثر طریقے سے چلانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، تو یہ خطے میں اسلام پسند گروہوں کے لیے ایک بڑا حوصلہ افزا پیغام ہوگا۔

نیویارک میں قائم سوفران گروپ کے پالیسی اور تحقیق کے ڈائریکٹر کولن کلارک کا کہنا ہے کہ یہ اخوان المسلمون جیسے گروہوں کے لیے ایک عملی نمونہ بن سکتا ہے۔

////// باقی صفحہ نمبر ۱۱ \\\\\\

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950